خوشبوئے خاک
انیس اشفاق

(رپورتاژ)

عالمی جشنِ شاعری ۱۹۸۹ء
بھارت بھون (بھوپال)

انیس اشفاق

سرورق : نیر مسعود

پہلی اشاعت : ۲۰۱۳ء

ناشر : انیس اشفاق

قیمت : ۱۵۰

تعداد : ۳۰۰

جائے فروخت : ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، دہلی
ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ
دانش محل لکھنؤ

'گل زمین'، ۴/۱۵۸، وپل کھنڈ، گومتی نگر، لکھنؤ، ۲۲۶۰۱۰
موبائل: 09451310098

عالمی جشن شاعری میں شریک
شعرااور مندوبین
کے نام

نوٹ : عالمی جشن شاعری میں شریک شاعروں میں ٹوماس ٹرانسٹرمر کو
سال ۲۰۱۱ء کے ادب کے نوبیل انعام سے نوازا جا چکا ہے
اور دوسرے کئی شاعر اس انعام کی قطار میں کھڑے ہیں۔

"The *good* smell *of* the dust / that
is the same / *everywhere* around the earth."

Dennis Brutus
(South Africa)

فہرست

نوٹ: صبحوں کی سرخیوں کے عنوانات انیس کے مصرعوں پر رکھے گئے ہیں۔

عالمی جشنِ شاعری کے مہتمم

اشوک باجپئی

ہندستان میں فنونِ لطیفہ کی ترویج وترقی کے ادارے بھارت بھون (بھوپال) نے نہرو صدی تقریبات کے موقع پر پنڈت جواہر لال نہرو کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے ۱۱ر تا ۱۷ر جنوری (۱۹۸۹ء) شاعری کے ایک سات روزہ عالمی میلے (سمینار) کا انعقاد کیا تھا۔ اس میلے میں دنیا کی تینؔ زبانوں کے صفِ اوّل کے شاعروں نے اپنی تخلیقات پیش کی تھیں۔ ہندستان میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا عظیم بین اقوامی شعری اجتماع تھا۔ اس اجتماع میں بہ حیثیت شاعر اردو کی نمائندگی جناب اخترالایمان نے کی تھی اور اردو کے نامور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی اور راقم الحروف اس میں مشاہدین کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔

ہندستان کی ادبی تاریخ میں یہ عظیم شعری اجتماع اس اعتبار سے بھی اہم تھا کہ اس میں ہر شاعر کی تخلیق پر کھل کر بحث ہوئی اور فنِ شاعری پر عمومی سوالات کے ساتھ ساتھ ہر شاعر کی تخلیق کے حوالے سے اس کے فن پر خصوصی گفتگو بھی کی گئی۔

انیس اشفاق

نوٹ: یہ رپورتاژ ماہنامہ شب خون (اگست، ستمبر، اکتوبر ۱۹۸۹ شمارہ ۱۵۶)
میں شائع ہو چکا ہے۔

مجھے بتاؤ تمھاری موت حقیقتاً کس طرح واقع ہوئی

مجھے سب کچھ بتاؤ

آخر تم نے خود کو مار ہی لیا

مجھے بتاؤ کیا خنجر کے قبضے پر تمھاری گرفت

جب کہ وہ تمھارے پیٹ میں آدھا اتر چکا تھا،

کمزور پڑ گئی تھی؟

کیا تم نے اپنے ہاتھ اوپر کی طرف اچھالے تھے

تا کہ تم اپنے نکلتے ہوئے دم کو روک سکو

کیا تم رو پڑے تھے

تمھارے مرنے کا صحیح صحیح وقت کیا تھا

آسمان صاف تھا یا ابر آلود؟

کیا ہوا نے درختوں کو ہلایا تھا

یا وہاں ہوا تھی ہی نہیں، جیسے یہاں نہیں ہے

(سوالات اُس شہزادی کے جس نے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی)

رما کانت رتھ

(۱)

جھیل کے شفاف اور ٹھہرے ہوئے پانی پر آسمان میں اڑتے ہوئے پرندوں کی ایک قطار اپنے پروں کے سائے ڈالتی ہوئی آگے نکل گئی۔ ابھی اس قطار کے سائے پانی کی سطح سے پوری طرح مٹنے بھی نہ پائے تھے کہ ایک دوسری قطار نیچے کی طرف آئی اور ٹھہرے ہوئے پانی میں اپنے پروں اور منقاروں کو بھگوتی ہوئی اوپر آسمان کی طرف اڑتی چلی گئی۔ اڑتے ہوئے پرندوں کی آتی جاتی ہوئی یہ قطاریں جھیل کے اوپر پھیلے ہوئے آسمان پر طرح طرح کے زاویے بناتی ہوئی مختلف سمتوں میں نکل جاتیں اور جب ان میں سے کوئی قطار خاموش جھیل کے پانی کو چھوتی ہوئی گزرتی تو پھیلتے اور سمٹتے ہوئے پروں کی صداؤں، منقاروں سے نکلنے والی آوازوں اور ٹھہرے ہوئے پانی میں پیدا ہونے والے انتشار سے فضا میں ایک خوب صورت آہنگ پیدا ہوتا اور اسی وقت جھیل کا سویا ہوا منظر بیدار ہو جاتا، پھر دور تک پھیلی ہوئی جھیل کا یہ جاگتا ہوا منظر ایک خوب صورت شاعرانہ پیکر میں تبدیل ہوتا ہوا معلوم ہونے لگتا۔

سوئے ہوئے منظر کو بیدار کرنے والی اسی جھیل کے ایک کنارے پر وہ عمارت بنی ہے جو ہندستان میں فنون لطیفہ کا گہوارہ ہے اور جسے دنیا نے بھارت بھون کے نام سے اس وقت جانا جب ۱۳ر فروری ۱۹۸۲ء کو ہندستان کی آنجہانی وزیر اعظم اندرا گاندھی نے اس کا افتتاح کیا۔ اس انوکھی اور نئی طرز کی عمارت کا نقشہ مشہور عالم ماہر تعمیرات چارلس کوریا نے تیار کیا تھا۔

فن کا یہ مرکز ایک ایسے خوب صورت مقام پر بنا ہے جہاں سے آپ کی نگاہ جھیل کے

پانی سے گزرتی ہوئی بھوپال کے اُس پرانے اور تاریخی شہر پر جا کر ٹھہر جائے گی جو اسی جھیل کے دوسری طرف آباد ہے۔ یہاں سے کھڑے ہو کر جب ہم پرانے شہر پر نگاہ ڈالتے ہیں تو حلقۂ نگاہ میں آیا ہوا یہ منظر بھی رفتہ رفتہ ایک خوب صورت شاعرانہ پیکر میں بدلنے لگتا ہے۔ ان منظروں کو دیکھنے والا جب اس عمارت میں داخل ہوتا ہے تو فوراً ہی اس کے طلسم خانوں میں غائب ہو جاتا ہے اور کچھ ہی دیر بعد یہ حیرت خانے مرحلہ بہ مرحلہ اُس کے سامنے اس طرح آنے لگتے ہیں: یہ روپانکر (Roopankar) ہے، ہندستان کے نامور مصوروں کی شاہ کار تصویروں کا مرکز۔ ابھی دیکھنے والا ان تصویروں کی توصیف شروع ہی کرتا ہے کہ اس کے کانوں میں پس منظر کی موسیقی کے ساتھ مکالموں کی صدائیں آنے لگتی ہیں اور وہ تصویروں کے سحر سے نکل کر رنگ منڈل (Rang Mandal) میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہاں ایک خوش نما اسٹیج پر گھٹتی بڑھتی ہوئی روشنیوں میں انسانی جذبات و احساسات کی سچی اور پر اثر عکاسی کرتے ہوئے اداکار اُس کی حیرت کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ اس کی نگاہ ابھی چہروں کے تاثرات کو پڑھ ہی رہی ہوتی ہے کہ اچانک روشن ہوتی ہوئی ایک راہداری اُس کے سامنے آجاتی ہے اور وہ اس راہداری سے ہوتا ہوا کلاسیکی اور لوک سنگیت کے نایاب ذخیرے 'انحد' (Anhad) میں قدم رکھتا ہے اور ابھی وہ اِن محفوظ کی ہوئی مسحور کن آوازوں کو سُن ہی رہا ہوتا ہے کہ اسے کوئی بلند خوانی کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ اُس طرف بڑھتا چلا جاتا ہے جس طرف سے لفظ و معنی کو منور کرتی ہوئی یہ آواز آرہی ہوتی ہے۔

یہ 'واگرتھ' (Vagarth) ہے۔ بھارت بھون میں ہندستانی شاعری کا مرکز۔ واگرتھ دو لفظوں کا مجموعہ ہے۔ واگ + ارتھ۔ جس کا مطلب ہے صوت و معنی۔ اور صوت و معنی کے اسی رشتے کو ظاہر کرنے کے لیے بھارت بھون نے نہرو صدی تقریبات کے سلسلے میں واگرتھ کے ماتحت ۱۱ر جنوری ۱۹۸۹ء سے ۱۷ جنوری ۱۹۸۹ء تک ایک سات روزہ شعری میلے کا انعقاد کیا جس میں چھ براعظموں کے صف اول کے ۳۰ شاعروں نے شرکت کی۔

(۲)

پہلی صبح: ۱۱ جنوری

گویا زمیں پہ نصب تھا اک تازہ آسماں

۱۱ رجنوری کی صبح جب میں نے جھیلوں اور تالابوں کے شہر بھوپال میں بھارت بھون کی سرزمین پر قدم رکھا تو 'واگرتھ' کے پہلو میں بہتی ہوئی جھیل کے خوب صورت منظروں نے فضا میں ایک نیا آہنگ پیدا کر دیا تھا۔ میں اس آہنگ سے ہم آہنگ ہوتا ہوا 'واگرتھ' کی طرف بڑھ رہا تھا۔ واگرتھ میں داخل ہونے سے قبل میری نگاہ بھارت بھون کے ان گنبدوں پر جا کر ٹھہر گئی جن پر ہندستان کے مشہور مصور سوامی ناتھن نے اس میلے کی تیاری کے سلسلے میں خوش نما رنگوں سے گل کاریاں کی تھیں۔ انھیں گل کاریوں میں ایک گنبد پر بھوپال گیس المیے کی تاریخ ۸۴-۱۲-۳ کو اس طرح لکھا گیا تھا کہ وہ اس عظیم انسانی المیے کی سنگینی اور اس سے پیدا ہونے والے مصائب کو پوری طرح ظاہر کر رہی تھی۔ سوامی ناتھن کی مصوری کے ان کمالات کو دیکھنے کے بعد اب میری نگاہ کے سامنے بھارت بھون کے مشترکہ صحن میں رکھے ہوئے وہ اسٹینڈ تھے جن میں سے ایک پر مدعوئین کے لیے میلے کے تفصیلات واطلاعات موجود تھے اور

ایک اسٹینڈ پر ان شعرا کی تصویریں لگا دی گئی تھیں جو افتتاحی اجلاس میں شعرخوانی کرنے والے تھے۔ صحن کی دیواروں پر میلے کے وہ پوسٹر لگے ہوئے تھے جن پر مدعو شعرا کی خوش رنگ اور جلی دستخطیں تھیں۔ واگرتھ کے ہال کے باہر مستعدی سے کھڑے ہوئے منتظمین ہر آنے والے کا خندہ پیشانی سے استقبال کر رہے تھے۔ میں جب ہال کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھا تو منتظمین نے مسکراتے ہوئے مجھے ایک اور دروازے کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ میں اس دروازے سے گزر کر ایک ایسے ہال میں داخل ہوا جہاں مدھیہ پردیش کی تہذیب وثقافت کے نمائندہ نمونوں کی نمائش کی گئی تھی۔ ان نمونوں کی توصیف و تحسین کرتا ہوا میں 'واگرتھ' کے عقبی دروازے تک جا پہنچا اور اس دروازے سے 'واگرتھ' کے وسیع ہال 'انتر نگ' میں داخل ہوا۔ مدعو شعرا اور مشاہدین اسی دروازے سے ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ پورا ہال روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اور ٹیلی ویژن پر افتتاحی جلسے کی کارروائی کو پورے ہندستان میں براہ راست دکھلانے کے لیے اس ہال کے دو کناروں پر دو طاقتور ویڈیو کیمرے لگے ہوئے تھے۔ ہال کے تین طرف سامعین کی نشستیں سیڑھیوں کی شکل میں بنی ہوئی تھیں اور درمیان میں حوض کی سی شکل میں ایک کشادہ جگہ تھی جسے اسٹیج کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی اسٹیج کے ایک کنارے پر تین زاویوں پر مڑی ہوئی سنہری چھڑوں سے تیار کیا ہوا ایک خوب صورت اسٹینڈ رکھا ہوا تھا جس پر بہت سے مائک لگے ہوئے تھے۔ اس اسٹینڈ پر جڑی ہوئی شیشے کی شفاف اور دبیز چادر نے اس کے حسن میں اور اضافہ کر دیا تھا۔

اسٹیج کے دوسرے کنارے پر سفید رنگ سے رنگے ہوئے لکڑی کے تین چوکھٹوں پر نمایاں اور جلی حروف میں لکھا ہوا تھا: ''واگرتھ ورلڈ پوئٹری فیسٹول''۔ اور اسی کے اوپر 'واگرتھ' کا لوگو (میلے کا نشان) بنا ہوا تھا جسے رائے گڑھ کے ایک قبائلی فنکار نے ٹین اور تانبے کی مرکب دھات سے تیار کیا تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگو دراصل ایک کرم ورکچھ (شجرِ عمل) تھا جس کی شاخوں پر عالمِ سرشاری میں جھول جھول کر نغمہ سرائی کرتے ہوئے نوجوان قبائلی جوڑے یکجائی، رفاقت، خواہش، قوت اور عمل کا استعارہ تھے۔ اسی لیے یہ درخت شاعری کی موزوں ترین علامت تھا اور اسی لیے اسے میلے کے لوگو کے طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ اسٹیج کے

پس منظر کے طور پر ایک بڑے سیاہ پردے پر جال بناتے ہوئے سفید تاروں کو اوپر سے نیچے تک بیضاوی شکل میں لٹکایا گیا تھا۔ اسٹیج کے بائیں طرف کے نصف حصے میں بید کی خوش نما کرسیاں بڑے قرینے سے لگی ہوئی تھیں جن پر عُنابی رنگ کے گدّے پڑے ہوئے تھے۔ مدعو شعرا وقفے وقفے سے ان کرسیوں پر آ آ کر بیٹھتے جا رہے تھے۔ اسی طرف کے نصف حصے میں مسندیں بچھی ہوئی تھیں جن پر گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ ان مسندوں پر مشاہدین کو بیٹھنے کی دعوت دی جا رہی تھی۔ میں نے مشاہدین کی دوسری صف میں اپنی جگہ سنبھالی اور ان کرسیوں کو شوقیہ نگاہوں سے دیکھنے لگا جن پر بیٹھے ہوئے شعرا میں سے بیشتر کو پہچاننے سے میں قاصر تھا لیکن اُن کی صورتیں دیکھ دیکھ کر قیاس کر رہا تھا کہ یہ فلاں ہو سکتے ہیں اور یہ فلاں۔ افتتاح کا وقت قریب آتا جا رہا تھا لیکن ابھی جالی دار پردوں کے نیچے لگی ہوئی دس کرسیوں والی ایک قطار خالی تھی۔ اسٹیج کی یہ مرکزی قطار غالباً خصوصی مہمانوں کی منتظر تھی اور کچھ ہی دیر میں یہ مہمانانِ خصوصی ان کرسیوں پر آکر بیٹھنے لگے: جنرل نریندر سنگھ، پوپل جے کر، مدھیہ پردیش کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ ارجن سنگھ، گھانا کے جواں سال شاعر کوفی آونور، چیکوسلوا کیہ کے شاعر میروسلا و ہولب، نکارا گوا کے بزرگ شاعر 'ارنسٹو کارڈینال' چین کی نو عمر شاعرہ شوتنگ، رگھو ویر سہائے، سوامی ناتھن، اور میلے کے مہتمم اشوک باجپئی۔ میں نے اپنی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ مقررہ وقت میں ابھی چند ساعتیں باقی تھیں۔ انھیں ساعتوں میں مدعو شعرا کی نشستوں اور مشاہدین کی صفوں کے درمیان چھوٹی ہوئی جگہ پر دو خوش پوشاک نوجوان سازندوں کے ساتھ آ کر بیٹھ گئے اور جیسے ہی وقتِ مقررہ پر سوئی پہنچی ان نوجوانوں نے دھیمی اور دل آویز موسیقی کے ساتھ 'کوی وندنا' شروع کر دی۔ یہ وندنا دراصل شاعروں کے تئیں غنائی خراج عقیدت تھی۔ وندنا ختم ہوتے ہی بھارت بھون کے سکریٹری اشوک باجپئی نے مائک پر آکر شعرا کا تعارف کرانا شروع کیا۔ ہر شاعر کے تعارف کے ساتھ بھارت بھون کی کارکن خواتین اُس شاعر کی خدمت میں ایک پھول بھی پیش کرتیں۔ تعارف کی اِس رسم کے بعد اشوک باجپئی نے افتتاحی خطبہ پڑھنا شروع کیا۔

شعرا کا پر جوش خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے خطبے کی ابتدائی سطروں میں اشوک باجپئی نے کہا کہ ہندستان کے سابق وزیرِ اعظم آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو نے ۶ رفروری ۱۹۵۰ء

کو ہندی کے مشہور شاعر شیو منگل سنگھ سُمن کی ڈائری میں لکھا تھا: ''ہمیں اپنی زندگی کو شعر بنا لینا چاہیے''۔ انھوں نے کہا کہ پنڈت نہرو بلا شبہ اس نکتے سے باخبر تھے کہ زندگی کو شدید یک جہتی کی ضرورت ہے اور شاعری اسے حاصل کرنے کا ایک راستہ ہے۔ انھوں نے اپنے طویل اور پُر مغز خطبے میں شاعری کی حقیقت و ماہیت بیان کرتے ہوئے معروف عالمی شعرا کی شہرۂ آفاق نظموں کے اُن اقتباسات کو پیش کیا جن میں ان شعرا نے اپنے تخلیقی تجربات بیان کیے تھے نیز شاعری کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا۔

اشوک باجپئی کے خطبے کے بعد مدھیہ پردیش کے (اس وقت کے) وزیر اعلیٰ ارجن سنگھ نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور پھر نہرو صدی تقریبات کمیٹی کے رکن جنرل نریندر سنگھ اور بھارت بھون کی چیرمین پوپل جے کرنے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان تقریروں کے بعد سلسلہ شروع ہوا افتتاحیہ شعرخوانی کا۔ سب سے پہلے مائک پر آئے عالمی شہرت کے حامل چیکوسلواکیہ کے شاعر میروسلاو ہولب جنھوں نے اپنی ایک علامتی نظم سنائی جس کا عنوان تھا ''خاردار تاروں کے بارے میں مختصر بات''۔ پھر ہندی کے شاعر رگھو ویر سہائے نے اپنی ایک پرانی نظم پیش کی اور جب گھانا کے جواں سال شاعر کوفی آونور اپنے روایتی لباس میں نظم خوانی کے لیے مائک پر آئے تو سامعین نے تالیاں بجا کر اُن کا پر جوش خیر مقدم کیا۔ کوفی آونور نے اپنے مخصوص لہجے میں اپنی نظم ''بیمار دیوتا'' پڑھنا شروع کی:

جاؤ انھیں بتا دو کہ میں نے دریا پار کر لیا
جب کشتیاں خالی تھیں اور ملاح جا چکے تھے
(اس وقت)
میرے گیتوں کا دیوتا بیمار تھا
میں پہنچا تو او جھا کہیں گیا ہوا تھا؟
اُس کی کٹیا کے باہر بیٹھ کر
میں انتظار کرنے لگا

میرے گیتوں کا دیوتا کراہا
میں نے ہمت کی اور دروازہ کھٹکھٹایا
معالج دیوتا نے میری زبان میں کہا
''الٹے پاؤں اندر چلے آؤ''
اسی لیے میں الٹے پاؤں اندر گیا
اُس وقت میرے گیتوں کا دیوتا رو رہا تھا
میں نے اسے چوکی پر رکھ دیا
گھنٹیاں بجیں اور تین بار میرا نام پکارا گیا
ان بہت سی آوازوں کے درمیان میرا دیوتا کراہا
معالج دیوتا گویا ہوا
''تو نے اپنے دیوتا کی حکم عدولی کی ہے
اسے اپنے باپ کے دیوتا کے پاس لے جا''
لیکن اس سے پہلے کہ میں کٹیا کا دروازہ کھولتا
میرا دیوتا اپنے گیتوں میں نمودار ہوا
نئے پرقوت گیتوں میں
جو آج تک میں اس کے ساتھ گا رہا ہوں
مجمع نے ہمہ تن گوش ہو کر نظم کو سنا اور دل کھول کر داد دی۔

اس کے بعد نکاراگوا کے ممتاز شاعر ارنسٹو کارڈینال نے اپنی ایک نمائندہ نظم سنائی۔اور ان کے بعد اس میلے کی سب سے کم عمر شاعرہ چین کی شوتنگ نے اپنی نظم ''دو مستولوں والی کشتی'' سنانا شروع کی:
کہرے نے بھگو دیے ہیں میرے دونوں پر
مگر
ہوا ٹھہرنے نہیں دے گی مجھے
- - - - - - - - - - - - - - -

چند مصرعوں پر مشتمل اس نظم کے بعد افتتاحی شعرخوانی کا اختتام ہوا۔لیکن اس سے پہلے کہ اشوک باجپئی اس پروگرام کے اگلے مرحلے کا اعلان کریں میں نے چاروں طرف گردن گھما کر سامعین پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور دیکھا کہ میری ہی صف کے داہنی جانب کنارے پر اردو کے نامور نقاد شمس الرحمٰن فاروقی جلوہ افروز ہیں۔ فاروقی صاحب کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اب مدعو شعرا سے گفتگو کرنے میں زیادہ مزہ آئے گا۔ ابھی میں اپنی طرف فاروقی صاحب کی نگاہوں کے اٹھنے کا منتظر ہی تھا کہ اشوک باجپئی نے اس پروگرام کے آخری مرحلے کا اعلان کرتے ہوئے ارنسٹو کارڈینال سے درخواست کی کہ وہ اس موقع پر بھارت بھون کی طرف سے شائع ہونے والے مدعو شعرا کی نظموں کے انگریزی ترجموں کے مجموعے''واگرتھ'' کے اجرا کی رسم ادا فرمائیں۔اور ارنسٹو کارڈینال نے''واگرتھ'' کو ہاتھوں میں لے کر مسکراتے ہوئے اس کے سرورق کو سامعین کے سامنے کر دیا۔اور ٹھیک اسی طرح نائیجیریا کے شاعر گبرئیل اوکارا نے ان شعرا کی نظموں کے ہندی ترجموں کے مجموعے''پونروسو''(Punarvasu) کے اجرا کی رسم ادا کی۔ افتتاحیہ پروگرام کے ان اختتامی مرحلوں کے بعد بھارت بھون کے حیاتی ٹرسٹی اور مشہور مصور سوامی ناتھن نے صرف ایک جملے میں مہمان شعرا کا شکریہ ادا کیا اور چائے کے وقفے کے اعلان کے ساتھ اس تقریبِ اوّلین کا اختتام ہوا۔

چائے کا اہتمام بھارت بھون کے ان چبوتروں پر کیا گیا تھا جو جھیل کے کنارے ذرا اونچائی پر بنے ہوئے تھے۔ ہم سب ہال سے نکل کر انھیں چبوتروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ہال کے اندر اور باہر لوگ دستخطی کتابیں لیے ہوئے شاعروں کو گھیرے ہوئے تھے اور کچھ لوگ اِن گھیروں کو توڑ کر ہر زاویے سے شاعروں کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ تصویریں کھنچواتے اور دستخطیں کرتے ہوئے یہ شاعر بالآخر ان چبوتروں تک پہنچ گئے جہاں چائے اُنکی منتظر تھی۔لیکن یہاں بھی وہی سلسلہ جاری تھا۔میں سب سے پہلے فاروقی صاحب کی طرف بڑھا اور یوں انھیں اس میلے میں اپنے موجود ہونے کی اطلاع دی۔ پھر ہم دونوں اختر الایمان کی طرف بڑھے جنھوں نے ہم سے بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔اختر الایمان کے

پہلو میں ان کی بیگم بھی کھڑی ہوئی تھیں۔ ہمارے ہاتھوں میں کافی کے پیالے تھے اور ہماری گفتگو مختلف پہلوؤں پر ہو رہی تھی۔ بیچ بیچ میں فاروقی صاحب اور اختر الایمان سے معروف شخصیتیں لپک لپک کر ہاتھ ملاتیں اور مسکراتی ہوئی آگے بڑھ جاتیں۔ لوگ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے کافی اور چائے کی چسکیوں کے ساتھ ایک دوسرے سے محو گفتگو تھے اور افتتاحی تقریب کے کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہونے پر اظہار مسرت بھی کر رہے تھے۔ نامہ نگاروں میں گھرے ہوئے شعرا کبھی کبھی نظر اٹھا کر جھیل کے دوسرے کنارے پر آباد پرانے شہر کو دیکھتے اور پھر نامہ نگاروں کے سوالوں کے جواب دینے لگتے۔ جھیل کے پانی میں ارتعاش پیدا کرتی ہوئی خنک ہوائیں دور تک پھیلی ہوئی دھوپ کی چادر سے لپٹ لپٹ کر شوخیاں کر رہی تھیں۔ ادھر اُدھر گردش کرتے ہوئے ویڈیو کیمرے ان منظروں کو محفوظ کر رہے تھے۔ میں چائے کی پیالی ہاتھ میں لیے اپنی ٹکڑی سے کٹ کر جھیل کی پرسکون سطح کو دیکھ رہا تھا۔ میرا سایہ پھسل کر جھیل کے پانی تک پہنچنے ہی والا تھا کہ اشوک باجپئی نے مائکروفون پر چائے کے وقفے کے ختم ہونے کا اعلان کیا اور شعرا اور مشاہدین اپنی خالی پیالیاں میزوں پر رکھ کر بھروا گرتھ کے ہال کی طرف بڑھنے لگے۔ روشنیوں سے جگمگاتا ہوا یہ ہال رفتہ رفتہ سامعین سے بھرنے لگا اور اشوک باجپئی نے مقررہ وقت پر مائک پر آکر اس میلے کے پہلے باقاعدہ اجلاس کے آغاز کا اعلان کیا: ''دوستو! اس اجلاس میں آپ کے سامنے اپنا کلام پیش کریں گی چین کی نوعمر شاعرہ شوتنگ (Shuting)۔ اور فوراً ہی سفید پوشاک میں ملبوس آنکھوں پر چشمے کو درست کرتی ہوئی مائک پر آئیں شوتنگ۔

شوتنگ
چین : چینی

فیو جیان صوبے کے زیا موں مقام پر ۱۹۵۳ء میں پیدا ہونے والی شوتنگ چین کے مصنفین کی انجمن کی رکن بھی ہیں۔ ''دو مستولوں والی کشتی'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا اور جسے اُسی سال قومی انعام سے نوازا گیا۔ شوتنگ نے مائک پر آکر اپنے مجموعے کی ورق گردانی شروع کی اور ایک جگہ ٹھہر کر سامعین کو اپنی نظم کا عنوان بتایا: ''غیر متوقع ملاقات''۔ شوتنگ کی دوسری نظم تھی ''واپسی'' اور تیسری نظم ''گلِ نغمہ''۔ چوتھی اور پانچویں نظم کے عنوان مجھے یاد نہیں۔ ان نظموں کے انگریزی ترجمے پیش کیے اشوک باجپئی نے۔ شوتنگ کی نظم خوانی کے بعد سامعین کو مکالمے کی دعوت دی گئی۔ اس مکالمے میں جو سوالات کیے گئے ان کے جواب میں شوتنگ نے کہا کہ میرے شاعر بننے کا راز یہ ہے کہ جب مجھے اٹھارہ سال کی عمر میں اسکول جانے سے روکا گیا تو میرے دل میں ایک شاعرانہ جذبے اور ایک شعری سفر کی خواہش نے جنم لیا۔ ان نظموں میں آپ کو قنوطیت اس لیے نظر آتی ہے کہ اس میلے کے لیے منتخبہ نظموں میں سے بیشتر کا تعلق سبز انقلاب سے ہے۔ اُس زمانے میں میری نظمیں شائع بھی نہیں ہوئی تھیں۔ لیکن انقلاب کے بعد میں نے رجائیہ نظمیں بھی کہی ہیں۔ جی ہاں میرے

محبوب شاعر ہیں رویندر ناتھ ٹیگور۔ گیتا نجلی کا چینی ترجمہ پڑھ کر مجھے اپنے تخلیقی سفر میں ایک نئی تحریک ملی۔ میری نظموں کا موضوع ہیں اعلیٰ انسانی اقدار جن کا تحفظ ہر شاعر پر واجب ہے۔ شوتنگ نے اپنے مختصر اور فوری جوابوں سے سامعین کا دل موہ لیا در حالیکہ دہلی سے آئے ہوئے اُن کے ترجمان میں وہ تیزی اور روانی نہیں تھی۔

شوتنگ کی نظم خوانی کے بعد اجلاس کے خاتمے کا اعلان ہوا۔ یہ لنچ کا وقفہ تھا۔ شوتنگ سامعین میں کھڑی ہوئی ہنس ہنس کر سب سے مبارکباد قبول کر رہی تھیں اور ہم 'انتر نگ' سے باہر نکل رہے تھے۔ میرے ساتھ ہی فاروقی صاحب، فضل تابش اور بھوپال کے شاعر وقار فاطمی بھی باہر نکلے۔ باہر نکل کر فاروقی صاحب نے تجویز رکھی کہ کہیں چل کر اچھا کھانا کھایا جائے۔ اور ہم سب فضل تابش کی رہنمائی میں کھانے کے ہوٹل کی طرف چل پڑے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم ایک اچھے ہوٹل میں داخل ہو گئے۔ کھانے کی میز پر فضل تابش کے لطیفوں نے کھانے کے لطف کو دوبالا کر دیا۔ فضل تابش یوں تو پٹھان ہیں لیکن خدوخال کے اعتبار سے یونانی معلوم ہوتے ہیں۔ گوری رنگت پر سن سفید لہریہ بالوں نے اُن کی شخصیت کو اور بھی پرکشش بنا دیا ہے۔ وہ لقمے توڑتے جا رہے تھے اور بھوپال میں اپنے اجداد کی آمد کی تاریخ بیان کرتے جا رہے تھے۔ اسی تاریخ کے ضمن میں انھوں نے مشہور فقرے ''بڑ وکاٹ بھوپالی'' کی شانِ نزول بھی بتا ڈالی۔ بیچ بیچ میں کھانے کے ذائقے پر تبصرہ بھی ہو رہا تھا اور اشوک باجپئی کی غیر معمولی تنظیمی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کیا جا رہا تھا۔ یہیں فاروقی صاحب نے یہ خوش خبری بھی دی کہ غالب انسٹی ٹیوٹ ''تفہیم غالب'' کی ابتدائی دو جلدیں بہت جلد شائع کر رہا ہے۔ میں اور وقار فاطمی بیچ بیچ میں ایک دو جملے بول کر خاموش ہو جاتے۔ کھانا ختم ہوا تو میں نے اور فاروقی صاحب نے چائے طلب کی۔ فضل تابش اور وقار فاطمی نے چائے پینے سے اس لیے انکار کر دیا کہ آیا ہوا سرور جاتا رہے گا۔ فضل تابش نے بل کی ادائی پر فاروقی صاحب سے خاصی بحث و تکرار کے بعد یہ بل خود ہی ادا کر دیا اور ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ باہر نکل کر ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ قیلولے کے لیے کہاں چلا جائے کہ فضل تابش نے اپنی اکادمی چلنے کی تجویز پیش کی اور کچھ دیر

میں ہم سب ان کی اکادمی پہنچ گئے۔ اکادمی میں فضل تابش نے اپنے عملے اور کتابت اسکول کی طالبات سے ہماری ملاقات کرائی اور ان طالبات کو یہ بھی بتایا کہ اس اسکول کا افتتاح انہیں شمس الرّحمٰن فاروقی نے کیا تھا۔ اکاڈمی کے مختلف کمروں سے ہوتے ہوئے ہم بالائی منزل پر پہنچے جہاں دھوپ میں ہمارے لیے کرسیاں ڈلوا کر فضل تابش خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گئے اور اکادمی کی کارگزاریوں کی روداد سنانے لگے۔ اسی اثنا میں بھوپال میں اردو کی استاد ڈاکٹر شفیقہ فرحت بھی آگئیں اور سب سے علیک سلیک کر کے تیز اور بلند لہجے میں اس بات کی شکایت کرنے لگیں کہ دعوت نامہ ہونے کے باوجود انھیں میلے کی افتتاحی تقریب میں جانے سے روک دیا گیا۔ وہ ہم لوگوں پر اس طرح برس رہی تھیں جیسے اس اہانت آمیز رویے کے ذمہّ دار ہم ہی ہوں۔ بیباک اور طرّار ہونے کے باوجود وہ عورت پن کی گرفت سے خود کو پوری طرح آزاد نہیں کر سکی تھیں اور اپنے بولنے کے سامنے ہمارے سننے کی ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں تھی۔ وہ بولتی رہیں، ہم سنتے رہے یہاں تک کہ دوسرے اجلاس کا وقت قریب آنے لگا اور ہم بھارت بھون جانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

مدھیہ پردیش اردو اکادمی سے بھارت بھون زیادہ دور نہیں ہے۔ کچھ ہی دیر میں ہم بھارت بھون پہنچ گئے۔ یہاں اشوک باجپئی مہمانوں سے جلد سے جلد ہال میں پہنچنے کی درخواست کر رہے تھے۔ ہم ''انترنگ'' میں پہنچے تو اسٹیج کا پورا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ شعرا اور مشاہدین کی نشستوں کے زاویوں کو بدل دیا گیا تھا۔ اسٹیج کے ایک کونے پر ٹوٹے ہوئے گھڑوں اور ان کے ٹھیکروں سے ایک خوبصورت سا گنبد بنا کر ان پر سفید رنگ چھڑک دیا گیا تھا جس سے ان گھڑوں پر مختلف قسم کے خوش نما نقوش بن گئے تھے۔ ہال سامعین سے بھر چکا تھا۔ اشوک باجپئی نے ٹھیک وقت پر مائک سنبھالا اور ڈنمارک کے جواں سال شاعر ہنرخ نارڈ برانٹ (Henrik Nordbrandt) کو اپنا کلام سنانے کی دعوت دی۔ فوراً ہی ایک دل چسپ، پرلطف اور لاابالی شخص اپنے بکھرے ہوئے کاغذات سنبھالتا ہوا مائک پر آ گیا۔

ہنرخ نارڈ برانٹ

ڈنمارک: ڈینش

نارڈ برانٹ نے اپنی نظموں کے ترجمے انگریزی میں خود ہی کیے تھے اور انھیں ترجموں کے ذریعے وہ سامعین سے ہم کلام ہوئے ''وہ محوِ خواب ہے تمھاری بانہوں میں''، ''جہاز رانی''، ''زلزلہ''۔ نارڈ برانٹ اپنی نظمیں سناتے چلے گئے۔ ایک نظم انھوں نے ایسی بھی سنائی جو خیام سے متاثر ہو کر کہی گئی تھی۔ نارڈ برانٹ آج کل اسپین میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اس عہد میں انتہائی دل چسپ' غنائی اور جدید طرز کی رومانی شاعری کی ہے اور ڈینش ادب میں اپنی مستقل حیثیت بنائی ہے۔ اب تک ان کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''خدا کا گھر'' (۱۹۷۷ء) ''منتخب نظمیں'' (۱۹۷۸ء) اور ''آرمینیا'' (۱۹۸۲ء)۔ انگریزی میں ان کے کلام کو ایلیگزنڈر ٹیلر نے منتقل کیا ہے۔

مکالمے کے وقفے میں نارڈ برانٹ نے اپنی حاضر جوابی اور مزاحیہ لب و لہجے سے اس شاعرانہ محفل کو قہقہہ زار بنا دیا۔ انھوں نے کہا کہ میری شاعری میرے ہی ملک کا منظر نامہ ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میں دنیا میں ہونے والے انسانی قتل عام سے

بہت اذیت میں مبتلا ہوں اور مایوسی نے میرے اندر گھر کرلیا ہے۔ دنیا میں چالیس ہزار بچے روز بھوک سے مر رہے ہیں اور اب تو دولت مند ملکوں نے اپنا زہر آلود کوڑا غریب ملکوں کو بھیجنا شروع کر دیا ہے۔ ایک مشاہد کے یہ پوچھنے پر کہ کیا شاعری سماجی تبدیلی کا وسیلہ بن سکتی ہے، نارڈ برانٹ نے کہا کہ میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ جب ایک سامع نے یہ سوال کیا کہ آپ شاعر ہی کیوں بنے تو نارڈ برانٹ نے فوراً جواب دیا: ''کیونکہ مجھے صبح جلد اٹھنا پسند نہیں تھا۔''

نارڈ برانٹ کے اس فقرے پر بلند ہونے والے قہقہے ابھی فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ اشوک باجپئی نے مراٹھی کے مشہور شاعر ارون کولہاٹکر سے ڈائس پر آنے کی درخواست کی لیکن کولہاٹکر نے ڈائس پر آنے کے بجائے اپنی نشست سے ہی اپنا کلام پڑھنا شروع کیا۔

ارون کولہاٹکر
ہندستان: مراٹھی

ارون کولہاٹکر مراٹھی کے علاوہ انگریزی میں بھی شاعری کرتے ہیں اور مصور بھی ہیں۔ ان کی مراٹھی اور انگریزی نظموں کے ترجمے ''ارون کولہاٹکر کویتا'' اور "Jejuri" کے

عنوان سے بالترتیب شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں انھیں دولت مشترکہ کا شاعری کا انعام بھی مل چکا ہے۔

کولہاٹکر نے بڑی بے دلی سے اپنی نظمیں سنائیں اور سامعین کے ذوق سماعت کا مطلق خیال نہیں کیا۔ انھوں نے کچھ نظمیں مراٹھی میں پڑھیں اور کچھ انگریزی میں۔ ان کی مراٹھی نظموں کا ہندی ترجمہ ہندی کے نوجوان شاعر دھروشکل نے پیش کیا۔

''ہوا کا نغمہ''، ''سوانح''، ''مراٹھی حروفِ تہجی کے چارٹ سے ایک تصویر'' وغیرہ ان کی نظموں کے عنوان تھے۔ ان میں سے بعض نظموں میں انھوں نے فحش لفظ بھی استعمال کیے تھے۔ اور ان کولہاٹکر نے کلام سنانے کے بعد چونکہ سامعین سے مکالمہ کرنے سے انکار کر دیا تھا، اس لیے جب ایک سامع نے ان سے سوال کیا کہ وہ ناشائستہ الفاظ کے استعمال سے کس مریضانہ ذہنیت کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے خاموشی اختیار کر لی۔

کولہاٹکر کے اس غیر شاعرانہ رویے پر سامعین کو حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی۔ اس اجلاس کے خاتمے کے بعد جب ہم 'انترنگ' سے باہر نکلے تو شام سیاہی کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ ہم نارڈ برانٹ اور کولہاٹکر کی نظموں پر گفتگو کرتے ہوئے بھارت بھون کے صدر دروازے کی طرف بڑھنے لگے۔ یہاں شاعروں اور مشاہدین کو اپنی اپنی منزلوں کی طرف لے جانے کے لیے بسیں بالکل تیار کھڑی تھیں۔ فاروقی صاحب اپنی سرکاری گاڑی میں بیٹھ کر گسٹ ہاؤس چلے گئے اور میں فضل تابش اور وقار فاطمی سے اجازت لے کر اپنی بس میں بیٹھ گیا اور کچھ ہی دیر میں ہوٹل 'پلاش' پہنچ کر اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ میرے ساتھ سندھی کے ادیب موتی لال جوتوانی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ہم دونوں نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور رات گئے تک ادب اور شاعری پر گفتگو کرتے رہے اور گفتگو کرتے کرتے نہ معلوم کب ہماری آنکھ لگ گئی۔

دوسری صبح: ۱۲ جنوری

ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح

۱۲ جنوری کا سورج طلوع ہوئے کافی وقت گزر چکا تھا۔ ہماری آنکھ اس وقت کھلی جب ہوٹل کے بیرے نے چائے کے لیے دروازے پر دستک دی۔ میز پر چائے کی کشتی رکھتے ہی اُس نے کہا: ''بس آپکو لے جانے کے لیے ٹھیک سوا نو بجے آ جائے گی۔'' ہم نہا دھو کر ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں کھڑی ہوئی بس نے ٹھیک وقت پر ہارن بجایا اور ہم تیار ہو کر نیچے اتر آئے۔ آج پہلی بار ہم نے مشاہدین کی صورتوں کو غور سے دیکھا اور ان میں سے کچھ کے بارے میں ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور کس زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مشاہدین میں ہندستان کی قریب قریب ہر زبان کے ادیب تھے۔ میں نے بس میں اپنے برابر بیٹھے ہوئے مراٹھی کے ادیب چندر کانت پاٹل سے پہلے روز کی تقریبات کے بارے میں گفتگو شروع ہی کی تھی کہ بس بھارت بھون کے پھاٹک پر پہنچ گئی۔ ہم ایک ایک کر کے بس سے نیچے اترنے لگے۔ باہر ایک ویڈیو کیمرا بس سے اترتے ہوئے مشاہدین کی فلم بندی کر رہا تھا۔ ہم کشاں کشاں 'واگرتھ' کی طرف بڑھنے لگے۔ اشوک باجپئی حسب معمول اپنے مہمانوں کے استقبال کے لیے 'واگرتھ' کے باہر کھڑے تھے۔ ہال میں جانے سے قبل میں نے بھارت بھون کے مشترکہ صحن میں رکھے ہوئے اس اسٹینڈ کو دیکھا جس پر پہلے روز کی تقریبات سے متعلق مختلف اخباروں کے تراشے لگا دیے گئے تھے۔ ایسا ہی ایک سہ رخی اسٹینڈ 'واگرتھ' کے برآمدے میں موجود تھا جس کے ایک رخ پر افتتاحی تقریب کی تصویریں لگا دی گئی تھیں۔ دوسرے رخ پر اُن شعرا کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جو آج کے اجلاسوں میں اپنا کلام پڑھنے والے تھے اور تیسری طرف اُن شعرا کے معذرت نامے تھے جو کسی سبب سے اس اجتماع میں شرکت کے لیے نہیں پہنچ سکے تھے۔ اجلاس کا وقت ہو چکا تھا۔ فاروقی صاحب بھی یہاں پہنچ

چکے تھے۔ میں ان کے ساتھ ہال میں داخل ہوا تو اسٹیج کا نقشہ پھر بدلا ہوا دیکھا۔ شاعروں اور مشاہدوں کی نشستوں میں پھر بڑی خوبصورت تبدیلی کر دی گئی تھی۔ اشوک باجپئی مائک پر پہنچ کر چمکتی ہوئی روشنیوں میں آج کے پہلے اجلاس کے پہلے شاعر کا اعلان کر رہے تھے: ''صاحبو! آج کے اس اجلاس کا آغاز انڈونیشیا سے آئے بھاہسا زبان کے شاعر ڈبلو۔ ایس رینڈ را سے ہوگا۔''

ڈبلو۔ ایس۔ رینڈرا

انڈونیشیا: بھاہسا

اس اعلان کے ساتھ ہی اسٹیج کے بالکل بیچ میں اپنی نشست پر بیٹھے ہوئے میانہ قد اور سانولی رنگت والے رینڈرا اٹھے اور مائک پر پہنچ کر شیشے کی شفاف اور دبیز چادر کے دونوں طرف ہاتھ رکھ دیے۔ پھر انھوں نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذوں سے پڑھی جانے والی نظموں کا انتخاب کیا پھر سامعین سے بھرے ہوئے ہال پر ایک نگاہ ڈالی، ایک خاص انداز سے خلا کی طرف دیکھا اور پھر اپنی نظم کی قرأت شروع کی جس کا عنوان تھا: ''جُھٹ پٹا''۔ رینڈرا نے ابھی پہلا ہی مصرعہ پڑھا تھا کہ سامعین ہمہ تن گوش ہو گئے۔ رینڈرا نظم پڑھتے جا رہے تھے اور سننے والوں کو محسوس ہوتا جا رہا تھا کہ وہ شاعری کی قرأت کے فن سے پوری طرح

واقف ہیں۔ رینڈ را نے نظم ختم کی تو ہر سننے والا گویا دم بخود تھا اور پورے ہال پر اُن کی قرأت کا سحر طاری تھا۔ سحر کے اسی عالم میں رینڈ را نے دوسری نظم شروع کی: ''جاکرتا میں دعا''۔ پھر تیسری نظم: ''جاکرتا کی طوائفیں''۔ میرے پہلو میں فاروقی صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ رینڈ را کی بلند خوانی سے وہ کس قدر خوش ہو رہے ہوں گے۔ رینڈ را اپنی چوتھی نظم پڑھ رہے تھے: ''چار لوگ''۔ اور پھر انھوں نے اپنی آخری نظم پڑھی: ''درخت کے نیچے ایک بوڑھے شخص کا نغمہ۔'' رینڈ را نے اپنی بلند خوانی سے ایک سماں باندھ دیا تھا۔ مجمع میں ہر طرف اس شاعر کی شعر خوانی کی داد دی جارہی تھی اور ہندی کی مشہور ادیب کرشنا سوبتی تو ان کی بلند خوانی سے اس حد تک متاثر ہوئیں کہ انھوں نے خراجِ عقیدت کے طور پر رینڈ را کو گلاب کا پھول یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ آپ میری طرح کے شاعر ہیں۔ رینڈ را نے اپنی نظموں میں فطرت کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ بڑے شہروں کے جیتے جاگتے مرقعے پیش کیے تھے۔

سوالات کے وقفے میں زیادہ تر سوالات بلند خوانی کی تکنیک کے بارے میں کیے گئے۔ ان سوالات کے جواب میں رینڈ را نے کہا کہ ہمارے یہاں کلاسیکی اور مذہبی شہ پاروں کو بلند آواز سے پڑھنے کی روایت عام ہے۔ یہاں تک کہ مہا بھارت بھی ہمارے یہاں اسی انداز میں پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کو ڈرامائی انداز میں پڑھنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ میرا تعلق تھیٹر سے ہے اور تھیٹر کی روایت ہمارے یہاں مذہب کی روایت سے مستعار ہے اس لیے ہمارے بیشتر فنون کے اسلوب و اظہار میں یہ ڈرامائی انداز پایا جاتا ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میرے یہاں تنقید کی صورت حال اطمینان بخش نہیں ہے۔ بہت سے نقاد تو مجھے شاعر ہی نہیں تسلیم کرتے۔ انھوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ سوہارتو کے زمانے میں انھیں جیل میں بھی رہنا پڑا۔

روانی کے ساتھ انگریزی نہ بول سکنے کی بنا پر رینڈ را نے سوالوں کے جواب میں کافی وقت لیا۔ ان کی آواز اب بھی 'انترنگ' کے ہال میں گونج رہی تھی۔ اور اسی گونج کے درمیان چائے کے وقفے کا اعلان ہوا۔

جھیل کے کنارے بنے ہوئے چبوتروں پر اس وقت رینڈ را ہی سب کی توجہ کا

مرکز تھے۔ نامہ نگار اُن سے طرح طرح کے سوال کر رہے تھے اور فوٹوگرافر ان کی تصویروں پر تصویریں کھینچ رہے تھے۔ مشاہدین شاعروں سے محوِ گفتگو تھے اور مہمان شعرا کی دستخطیں حاصل کرنے کے سلسلے اب بھی جاری تھے۔ میں اختر الایمان اور فاروقی صاحب کے ساتھ کھڑا ہوا یہ سارے منظر دیکھ رہا تھا اور چائے کے گھونٹ لیتا جا رہا تھا۔ چائے کے انھیں گھونٹوں کے ساتھ میں نے اختر الایمان سے بازار میں ان کے کلیات ''سروساماں'' کے دستیاب نہ ہونے کی شکایت کی۔ (یہ کلیات حال ہی میں خود اختر الایمان نے شائع کیا ہے)۔ جواب میں اختر الایمان نے اردو کے پبلشروں کی بے توجہی اور بد دیانتی کا شکوہ شروع کر دیا: ''ارے صاحب یہ لوگ کتابیں منگواتے ہی نہیں ہیں اور اگر منگواتے بھی ہیں تو معاملت میں دیانت داری سے کام نہیں لیتے۔'' میں اس حق بجانب شکوے کو سن ہی رہا تھا کہ اشوک باجپئی نے مائکروفون کو سنبھالتے ہوئے چائے کے وقفے کے ختم ہونے کا اعلان کیا اور سامعین سے ہال میں پہنچنے کی درخواست کی۔

میروسلاو ہولب
چیکوسلوا کیہ: چیک

اب جس شاعر کو نظم خوانی کرنا تھی اس کی گفتگو ہم نے انھیں چبوتروں پر شروع کر دی تھی۔ یہ شاعر

تھا چیکوسلوا کیہ کا میر وسلاو ہولب۔ ہولب کا شمار دنیا کے صفِ اوّل کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں پلسن، چیکوسلوا کیہ میں پیدا ہونے والے ہولب پیشے سے سائنس داں ہیں اور اس وقت او برلن کالج، اوہیو میں مہمان مصنف کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ وہ رائٹرز یونین کے رکن بھی رہے ہیں اور ''بورین اکاڈمی آف آرٹ'' کے ممبر بھی رہ چکے ہیں۔ چیک زبان میں ہولب کے اب تک آٹھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں ''جاؤ دروازہ کھول دو'' (۱۹۶۲ء)، ''تجسیم'' (۱۹۷۰ء) اور ''اس کے برعکس'' (۱۹۸۲ء) نے خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ ہولب کے ترجموں کے بھی پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے کلام کو دنیا کی کئی زبانوں میں منتقل کیا جا چکا ہے اور انھیں کئی اہم اعزازات بھی مل چکے ہیں۔

'انترنگ' میں اس وقت سامعین ہولب کے ڈائس پر آنے کے بے چینی سے منتظر تھے۔ اور جیسے ہی اشوک باجپئی نے ہولب سے مائک پر آنے کی درخواست کی، سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ۶۵ سالہ ہولب عمر کی اس منزل میں بھی پوری طرح چاق و چوبند تھے۔ وہ پھُرتی سے مائک پر آئے اور اپنی نظموں کے انگریزی ترجموں کو پڑھنا شروع کیا۔ انکی نظموں کے عنوان تھے: ''رات کی آخری بس''، ''خوردبین کے اندر''، ''سمندر پار کرتے ہوئے لوگ''، ''شاعر سے مکالمہ''، ''نظریۂ اضافیت'' اور ''سیلاب''۔ ان میں سے یہ دو نظمیں بہت پسند کی گئیں:

نظریہء اضافیت کے بارے میں مختصر بات

ایک دن پال والیری سے گفتگو کے دوران (یہ انکشاف کہ کیا کہا جائے، علم ہے)
البرٹ آئن اسٹائن سے سوال ہوا:
مسٹر آئن اسٹائن آپ اپنے خیالات کا کیا کرتے ہیں
کیا آپ انھیں ذہن میں آتے ہی لکھ لیتے ہیں؟
یا رات کو؟
یا صبح کے وقت؟
البرٹ آئن اسٹائن نے جواب دیا

موسیو والیری! ہمارے پیشے میں خیالات اتنے نایاب ہیں
کہ اگر کسی شخص کو کوئی خیال مل جائے
تو یقیناً وہ اس کو بھولے گا نہیں
سال بھر میں بھی نہیں

سیلاب کے بارے میں مختصر بات

اصل سیلاب سے مراد یہ ہے
کہ ہمارے منھ سے بُلبلے نکلیں
اور ہم سوچیں
کہ یہ لفظ ہیں

ہولب کلام سناتے جا رہے تھے اور ان کی نظموں کی معنویتیں روشن ہوتی جا رہی تھیں۔ انھوں نے اپنی آخری نظم ختم کی اور مکالمہ شروع ہوا۔

اس مکالمہ کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ ہولب سائنسی موضوعات میں کس طرح شاعرانہ معنویت پیدا کرتے ہیں اور کس طرح اسے کسی نہ کسی اہم انسانی یا کائناتی مسئلے سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں۔ ہولب سے سوال پر سوال کیے جا رہے تھے اور اس سے پہلے کہ یہ سلسلہ دراز ہوتا میں نے ان کی نظم ''شاعر سے مکالمہ'' کے حوالے سے تخلیقی عمل کی بعض پیچیدہ کیفیتوں کے بارے میں سوال کر لیا اور یہ بھی پوچھ لیا کہ کسی نظم کو تخلیق کرتے وقت وہ کیا محسوس کرتے ہیں؟ جواب میں ہولب تخلیقی عمل کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے بہت دور تک چلے گئے۔ سوالات کا وقفہ ختم ہوتا جا رہا تھا اور سوال کرنے والوں کا سلسلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہولب ہر سوال کا جواب بڑے عالمانہ انداز میں د ے رہے تھے۔ ان کے لہجے کے اعتماد سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع اور نظر بہت دقیق ہے۔ ہولب کے واضح اور مدلل جوابوں کے بعد اجلاس کے خاتمے کا اعلان ہوا اور سامعین کی صفوں سے لوگ ہولب کی طرف بڑھنے لگے۔ ان میں سے بعض اب بھی ان کی شاعری سے متعلق کوئی نہ کوئی سوال کیے جا رہے تھے۔ ڈائس پر دیر تک کھڑے رہنے اور مسلسل بولتے رہنے کے بعد بھی ہولب تھکے نہیں تھے اور جو پہلو مزید

تشریح کے متقاضی تھے، اُن کی تشریح اب بھی کر رہے تھے۔ کیمرے اُن کے چہرے پر اپنی روشنیاں ڈال رہے تھے اور ہولب کی چمکتی ہوئی آنکھیں اِن روشنیوں میں اور زیادہ چمک رہی تھیں۔ میں ان چمکتی ہوئی آنکھوں میں جھانکتا ہوا 'انترنگ' سے باہر نکل آیا۔ یہاں فاروقی صاحب فضل تابش اور وقار فاطمی موجود تھے۔ ہم سب ہولب کی شاعری پر دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ پھر اپنی اپنی منزلوں پر پہنچنے کے لیے بھارت بھون کے آہنی پھاٹک کی طرف بڑھنے لگے۔

اپنے اپنے ٹھکانوں پر آرام کرنے کے بعد ہم دوسرے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے مقررہ وقت پر بھارت بھون پہنچ گئے۔ 'واگرتھ' کے برآمدے والے اسٹینڈ پر ہولب اور رینڈرا کی صبح کے اجلاس والی تصویریں (کلام پڑھتے ہوئے) لگادی گئی تھیں اور اس اسٹینڈ کے ایک رخ پر نائیجیریا کے شاعر گبرئیل اوکارا (Gabriel okara) اور اُڑیا کے شاعر رما کانت رتھ کی تصویریں ان کے کلام کے نمونوں کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ یہ دونوں شاعر اِس اجلاس میں اپنا کلام پڑھنے والے تھے۔

گبرئیل اوکارا
نائیجیریا: انگریزی

اجلاس کا وقت ہو چکا تھا۔ لوگ رفتہ رفتہ 'انترنگ' میں داخل ہو رہے تھے۔ بعض

شر کا بھارت بھون کے بک اسٹال پر کھڑے تھے اور اس موقع پر شائع ہونے والے مطبوعات کی ورق گردانیاں کر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ ان مطبوعات کو خرید بھی رہے تھے۔ میں 'انترنگ' میں داخل ہوا اور مشاہدین کی صف میں جا کر بیٹھ گیا۔ مائک پر اجلاس کے پہلے شاعر گبرئیل اوکارا کا نام پکارا گیا اور نائیجیریا کے ٦٨ سالہ سیاہ فام شاعر اوکارا مائک پر آ گئے۔ گول چہرہ چوڑی پیشانی، بڑی بڑی آنکھیں، کھلا ہوا دہانہ اور آدھے سر پر پیچھے کی طرف کھنچے ہوئے سفید بال، نچلا ہونٹ نیچے کی طرف لٹکا ہوا۔ اوکارا انگریزی میں شاعری کرتے ہیں اور پیشے سے صحافی ہیں۔ امریکہ میں صحافت کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ مشرقی نائیجیریا کی حکومت میں افسرِ اطلاعات کے عہدے پر فائز رہے اور خانہ جنگی میں انھوں نے علاحدگی پسندی کی حمایت کی۔ ریورس اسٹیٹ حکومت کے اخبار The Nigerian Tide کا اجرا کیا اور اسی حکومت کی ٹیلی ویژن سروس کی بنا ڈالی۔ ١٩٧٨ء میں 'The Fisherman's Invocation' کے عنوان سے اوکارا کی نظموں کا مجموعہ شائع ہوا۔ ١٩٥٣ء میں نائیجیریا آرٹس فیسٹیول میں انھیں اپنی نظم ''دریائے نن کی پکار'' پر انعام بھی مل چکا ہے۔ اوکارا نے دھیمی آواز میں اپنی نظمیں پڑھنا شروع کیں: ''ہوائی حادثہ''، ''خاموش آواز''، ''عشق سے معمور دنیا''، ''جنگ کا استعارہ''، ''خاموش لڑکی'' اور 'Expendible name' وغیرہ۔

سوالوں کے وقفے میں اوکارا نے کہا کہ میں حقیقت اور سچائی کے لیے لکھ رہا ہوں اور انھیں چیزوں کو منعکس کر رہا ہوں جو مہاتما گاندھی کے فلسفے میں موجود ہیں۔ اوکارا نے افریقہ کی مقامی بولیوں کی موجودہ حالت اور انکو درپیش مسائل پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ افریقی ادب میں Decolonization کی صورت حال کیا ہے۔

افریقہ کی تحریکِ آزادی گبرئیل اوکارا کی نظموں کا مرکزی موضوع تھا۔ دنیا کے اہم اور مقبول موضوع کی ادائی کے باوجود اوکارا کی نظموں میں زیادہ گہرائی اور معنویت نہیں تھی۔ نائجیریا کے اس شاعر کی گفتگو ختم ہوتے ہی اجلاس کے دوسرے شاعر کے طور پر دعوتِ سخن دی گئی اڑیا کے شاعر رما کانت رتھ کو۔

رما کانت رتھ
ہندستان: اُڑیا

دراز قد، سنجیدہ، باوقار اور تیکھے نقوش والے رما کانت رتھ اڑیسہ کی حکومت میں ایڈیشنل چیف سکریٹری کے عہدے پر فائز ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں انھیں ساہیتہ اکاڈمی ایوارڈ اور ۱۹۸۴ء میں حکومت اڑیسہ کا سرلا ایوارڈ مل چکا ہے۔

سرمئی رنگ کے سوٹ میں ملبوس رما کانت رتھ باوقار انداز میں چلتے ہوئے مائک پر آئے اور اپنی خوبصورت فائل کھول کر پڑھی جانے والی نظموں کو ترتیب دینے لگے۔ پھر انھوں نے اپنی پہلی نظم کا انگریزی ترجمہ پڑھنا شروع کیا، ''میدانِ جنگ''۔ نظم کے علامتی اور پرقوت اسلوب کی بنا پر رتھ نے فوراً ہی غیر ملکی شعرا کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہولب، کارڈینال اور یوہاش، رتھ کے کلام کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔ رتھ کی دوسری نظم کا عنوان تھا:

اس دریا کے کنارے۔

اس دریا کے کنارے کہیں پر ایک گیت ہے

کہیں پر

سورج کا خون بہتا ہے

یہیں کہیں پر کسی کاغذ کے بکھرے ہوئے پرزے سمٹ آتے ہیں

تم پھر سے میری آغوش میں سمٹ آئی ہو

اور تمھاری واپسی

یادوں کی کتنی راہداریوں کو جگمگا رہی ہے

رتھ نے تیسری نظم ''جلاوطن سپاہی'' کے عنوان سے پڑھی۔ اور ان کی چوتھی نظم تھی:

سوالات اُس شہزادی کے جس نے نہ بولنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

مجھے بتاؤ تمھاری موت حقیقتاً کس طرح واقع ہوئی

مجھے سب کچھ بتاؤ

آخر تم نے خود کو مار ہی لیا

مجھے بتاؤ کیا خنجر کے قبضے پر تمھاری گرفت

جب کہ وہ تمھارے پیٹ میں آدھا اتر چکا تھا،

کمزور پڑ گئی تھی؟

کیا تم نے اپنے ہاتھ اوپر کی طرف اچھالے تھے

تاکہ تم اپنے نکلتے ہوئے دم کو روک سکو

کیا تم رو پڑے تھے

تمھارے مرنے کا صحیح صحیح وقت کیا تھا

آسمان صاف تھا یا ابر آلود؟

کیا ہوا نے درختوں کو ہلایا تھا

یا وہاں ہوا تھی ہی نہیں، جیسے یہاں نہیں ہے

اُڑیا کے اس شاعر کی آخری نظم تھی: ''استعارے ان محبت کرنے والوں کے لیے جواب لوٹ کر نہیں آئیں گے۔'' رتھ کی نظموں کے لمبے لمبے عنوان سن کر مجھے منیر نیازی یاد

آ گئے جو اسی طرح اپنی نظموں کے لمبے عنوان رکھتے ہیں۔فرق صرف یہ تھا کہ رتھ کی نظمیں بھی طویل تھیں جبکہ منیر نیازی نسبتاً مختصر نظمیں کہتے ہیں۔ان دونوں شاعروں کے یہاں مجھے بعض اور مشترک پہلو بھی نظر آئے۔دونوں پیچیدہ علامتی اسلوب کے شاعر ہیں۔دونوں کے موضوعات منفرد ہیں اور حیرت واسرار کا عنصر دونوں کے یہاں یکساں ہے۔

رتھ نے اپنی نظموں کے انگریزی ترجمے سنائے۔ یہ ترجمے انھوں نے خود کیے تھے۔ ایک دو نظمیں انھوں نے اُڑیا میں بھی پڑھیں۔ان کی نظموں کے موضوعات کی بلاغت نے غیر ملکی شعرا کو بہت زیادہ متاثر کیا۔بعض شعرا نے ان نظموں کے سلسلے میں سوالات بھی کیے اور رتھ نے اِن سوالوں کے معقول اور مدلل جواب دے کر مہمان شعرا کو یہ باور کرا دیا کہ ہندستانی شاعری عالمی شاعری کے مقابلے میں کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔

سننے والوں پر رفتہ رفتہ اپنے معنی منکشف کرتی ہوئی اس شاعری پر گفتگو کا سلسلہ ختم ہوا اور ہم پھر انھیں چبوتروں پر آ گئے جہاں چائے ہماری منتظر تھی۔

''کیا جاندار شاعر نکلا''۔میں نے چائے کی پیالی فاروقی صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ارے میاں اُڑیا میں ایک سے ایک پڑا ہوا ہے۔'' فاروقی صاحب نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں کہا: ''ابھی آپ نے علاقائی زبانوں کو کھنگالا کہاں ہے۔ہمیں رتھ کی نظموں کا ترجمہ کرنا چاہیے۔''

''بالکل۔''میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

رتھ شعرا اور شرکا میں گھرے کھڑے تھے۔ہم بھی انھیں کی شاعری پر گفتگو کر رہے تھے۔چائے ختم کر کے آج کی آخری تقریب کے لیے ہم پھر 'انترنگ' میں داخل ہو گئے۔اس تقریب میں پنجابی کے معروف شاعر ڈاکٹر ہربھجن سنگھ کو حکومت مدھیہ پردیش کا ڈیڑھ لاکھ روپے کا قومی انعام ''کبیر سمآن'' پیش کیا گیا۔ یہ انعام ہر سال کسی نہ کسی شاعر کو ہندستانی شاعری میں نمایاں خدمات کے اعتراف کے طور پر دیا جاتا ہے۔ڈاکٹر ہربھجن سنگھ کو یہ سمآن پیش کیا چیک شاعر میروسلاو ہولب نے۔

تقریب کے بعد ہم باہر نکلے تو رات پوری طرح پھیل چکی تھی۔ میں نے فاروقی صاحب، فضل تابش اور وقار فاطمی صاحبان سے رخصت لی اور اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے دن بھر کی روداد مرتب کی۔ پھر بستر پر دراز ہو کر اپنے سندھی ساتھی سے گفتگو کرنے لگا اور رات کے کسی حصے میں ہم دونوں کو نیند آ گئی۔

تیسری صبح: ۱۳ر جنوری
پنہاں نظر سے روئے شبِ تار ہو گیا

آنکھ کھلی تو مجھے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ پہلے میں بیدار ہوا یا پہلے صبح نمودار ہوئی۔ کھڑکیوں پر پڑے ہوئے دبیز پردوں نے روشنی کا راستہ روک رکھا تھا اور میں باہر آسمان کی طرف نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن کہیں بہت دور سے آتی ہوئی اذان کی آواز میرے کانوں میں پڑ چکی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں سورج نکلنے سے پہلے ہی بیدار ہو گیا ہوں۔ سوئے ہوئے درختوں پر بیدار ہوتے ہوئے پرندوں کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ میری زبان پر بے اختیار رحمٰ کا یہ شعر جاری ہو گیا:

سحر کو سب پرندے جب تری تسبیح پڑھتے ہیں چمن میں ہر طرف ہوتی ہے تیری گفتگو زندہ

میرے سندھی ساتھی کروٹیں بدل رہے تھے۔ کروٹیں بدلتے بدلتے آخر انھوں نے بھی آنکھ کھول دی۔ تھوڑی دیر بعد ہم صبح کی چائے پی کر اپنی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ تیار ہو کر ہم کمرے سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ بھارت بھون کے ایک کارکن نے دروازے پر دستک دی۔ میں نے دروازہ کھولا تو اس نے ہمارے اعزازیوں کے لفافے بڑے ادب کے ساتھ ہمارے ہاتھوں پر رکھ دیے اور ہم نے فہرست میں اپنے ناموں کے سامنے دستخط کر دیے۔ میرے سندھی ساتھی نے اعزازیے کی رقم کا حساب لگا کر اپنے حساب کو درست کر لیا اور مجھے بھی بتا دیا کہ آپ کی رقم بھی بالکل ٹھیک ہے۔ میرے سندھی ساتھی حساب لگاتے یا نہ لگاتے

بھارت بھون کے نظام میں غلطی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے میں نے آنکھ بند کر کے اپنا لفافہ اپنے سوٹ کیس میں رکھ دیا اور بھارت بھون جانے کے لیے کمرے سے باہر نکل آیا

'واگرتھ' کے برآمدے والے اسٹینڈ پر ۱۴ر جنوری کا پروگرام چسپاں کر دیا گیا تھا۔ آج جن شعرا کو اپنا کلام سنانا تھا اُن میں آسٹریلیا کی جوڈتھ روڈ ریگیز (Judith rodriguez)، جنوبی کوریا کے چانگ ہیان جانگ (Chong Hyon Jong)، انگلستان کے کریگ رین (Craig Rain) اور پنجابی کے ہربھجن سنگھ شامل تھے۔ اسٹینڈ پر ہم ان شاعروں کی تصویریں اور ان کے کلام کے نمونوں کو دیکھتے ہوئے 'انتر نگ' میں داخل ہو گئے۔ ہال میں داخل ہوتے ہی ہماری نگاہ سیاہ پردے پر اوپر سے نیچے تک لٹکی ہوئی ان پانچ خوشنما پٹریوں پر جا ٹکی جنھیں مدھیہ پردیش کے نوجوان مصور اکھلیش نے دَونوں اور پتلوں کی مدد سے تیار کیا تھا۔ ان پٹریوں کے پس منظر نے اسٹیج کو بہت خوبصورت بنا دیا تھا۔ غیر ملکی شعرا بار بار ان پٹریوں کی طرف توصیفی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

جوڈتھ روڈ ریگیز
آسٹریلیا: انگریزی

اس خوبصورت اسٹیج پر تھوڑی دیر میں نمودار ہوئیں جوڈتھ روڈ ریگیز۔ پھیلا ہوا چہرہ،

ابھری ہوئی ناک، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑا دہانہ، گھنے سیاہ بالوں سے آدھی پیشانی ڈھکی ہوئی، بولنے اور مسکرانے میں ان کے چہرے پر شکنیں پڑنے لگتیں۔ مجموعی طور پر روڈ ریگیز کے خدوخال نسوانی کم اور مردانہ زیادہ تھے۔ ڈائس پر آکر انھوں نے ایک کے بعد ایک کئی چھوٹی چھوٹی نظمیں پڑھ ڈالیں۔ شاعرہ کے ذاتی ماحول اور پس منظر کی آئینہ دار ان ہلکی پھلکی نظموں میں زندگی کے تضادات کو پیش کیا گیا تھا۔ روڈ ریگیز کی بعض نظموں میں عالمی طاقتوں کے سیاسی ہتھکنڈوں کو طنز کا نشانہ بنا کر سیاسی اور سماجی قدروں پر کڑی تنقید کی گئی تھی۔ اُن کی سب سے پُر اثر نظم تھی ''امریکہ سے خطوط''۔ اس نظم میں توسیع پسندی کی پالیسی میں آسٹریلیا کے غیر جانبدارنہ کردار کا ذکر کیا گیا تھا۔ بہ حیثیت مجموعی روڈ ریگیز کی نظمیں عالمی شاعری کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں۔

سوالوں کے وقفے میں روڈ ریگیز سے بہت عامیانہ سوال کیے گئے۔ ایک اہم سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ قافیہ بندی ان کی شاعری کا ایک اہم اوزار ہے۔ اس سے شاعری زیادہ منظم ہو جاتی ہے۔ شعریت اور غنائیت بھی اسی قافیہ بندی سے پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نظم تخلیق کرتے وقت مصرعے خود بخود مقفیٰ ہوتے چلے جاتے ہیں۔

روڈ ریگیز کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں انھیں جنوبی آسٹریلیا کا دوسالہ ادبی انعام اور ۱۹۸۰ء میں پی۔ ای۔ این کا بین الاقوامی انعام بھی مل چکا ہے۔

آسٹریلیائی شاعرہ کی بات چیت کے بعد جب ہم چائے کے لیے باہر نکلے تو دیکھا کہ ایک خوش شکل خاتون ہاتھوں میں ایک رسالہ لیے ہوئے اختر الایمان کو دکھا رہی ہیں۔ قیمتی کاغذ اور عمدہ طباعت والا یہ رسالہ اطالوی زبان میں تھا اور اس میں اختر الایمان کا باتصویر انٹرویو شائع ہوا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ان خاتون کا نام میری آرچر ہے اور وہ ہندستانی شاعری پر کام کر رہی ہیں، اس میلے میں مشاہد کی حیثیت سے آئی ہیں اور اختر الایمان کا یہ انٹرویو انھوں نے کئی نشستوں میں لیا ہے۔ چائے پر میری آرچر فاروقی صاحب اور اختر الایمان سے ہندستانی شاعری پر گفتگو کرتی رہیں۔ چائے ختم کرنے کے بعد ہم جنوبی کوریا کے شاعر چانگ ہیانگ جانگ کا کلام سننے کے لیے واپس اپنی جگہوں پر آگئے۔

چانگ ہیان جانگ
جنوبی کوریا: کوریائی

دبلے پتلے میانہ قد کے چانگ ہیان کی شخصیت میں کوئی کشش نہیں تھی۔ کمزوری اور نقاہت ان کے چہرے سے ظاہر تھی۔ اپنے نام کے اعلان پر وہ آہستہ روی سے مائک پر آئے اور جب نظم خوانی شروع کی تو ایسا معلوم ہوا کہ ساری قوت ان کی آواز میں سمٹ آئی ہے۔ کلام سنانے سے قبل سامعین سے مخاطب ہوتے ہوئے چانگ ہیان نے کہا کہ کل رات مجھے گہری نیند نہیں آئی اور صبح ہوتے میں نے خواب میں اُن سارے سوالوں کو سنا جو آپ یہاں پوچھنے والے ہیں اور خواب ہی میں میں نے ان کے جواب بھی دے ڈالے۔ یہ خواب سنا کر چانگ ہیان نے گویا سوالوں سے بچنے کی پیش بندی کر لی تھی۔

ہال میں ان کی آواز گونج رہی تھی اور اب وہ اُس نظم کو پڑھ رہے تھے جو انھوں نے بھوپال گیس المیے سے متاثر ہو کر اس وقت کہی تھی جب اخباروں میں اس عظیم سانحے کی خبریں تصویروں کے ساتھ شائع ہوئی تھیں۔ اُن کی بقیہ نظموں کے عنوان تھے: ''اداکاروں سے''، ''شاعری، مجہول شاعری''، بوڑھی اور بیمار دنیا''، ''بھکاری اور دیوانہ''، ''دُکھ۔سُکھ'' اور ''علامتِ فجائیہ۔''

چانگ ہیان۔ یون سئی (Yonsei) یونیورسٹی میں فلسفے کے استاد ہیں۔ اسی لیے فرد کے باطنی اور روحانی مسائل ان کی شاعری کا موضوع ہیں۔ اِس موضوع کو انھوں نے اپنی

نظموں میں خالص علامتی اسلوب میں پیش کیا۔

سامعین سے مکالمہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اُن کے یہاں کے عصری ادب میں زین بدھ مت کا اثر واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔اُن کی ایک نظم میں اڑیسہ میں منتر وں کے پڑھنے کا ذکر بھی آیا تھا۔اس کا سبب پوچھے جانے پر انھوں نے کہا کہ میں کبھی اڑیسہ نہیں گیا۔میری نظم میں یہ اثرات بدھ مذہب کے وسیلے سے آئے ہیں۔ ڈنمارک کے ہنرخ نارڈ برانٹ نے جب ان سے سیول اولمپک کے پس منظر میں لکھی جانے والی ایک نظم کے بارے میں کچھ جاننا چاہا تو چانگ نے'' پھر کسی اور وقت مولا نا'' والے انداز میں اس کا جواب ٹال دیا۔

چانگ ہیان جانگ کے پانچ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔انھوں نے رابرٹ فراسٹ ، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ اور پابلو نرودا کی منتخب نظموں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ یہ ترجمے مجموعوں کی شکل میں ۷۳،۷۴ءاور ۱۹۸۸ء میں بالترتیب شائع ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں انھیں اپنے شعری مجموعے 'I am star uncle' پر'' کوریائی رائٹرس پرائز'' بھی مل چکا ہے۔

چانگ ہیان کے کلام پر اجلاس ختم ہوا اور ہم اس فلسفی شاعر کی نظموں کے علامتی پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے مصنوعی روشنیوں سے نکل کر چمکتی ہوئی دھوپ میں آ گئے۔اسی چمکتی ہوئی دھوپ میں میری ملاقات اجین یونیورسٹی کے پروفیسر اظہر راہی سے ہوئی۔ فاروقی صاحب، فضل تابش اور وقار فاطمی یہاں پہلے سے موجود تھے۔فضل تابش آج ہمیں اپنے گھر لے جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ کچھ وقت بھارت بھون کی کینٹین میں گزار کر ہم سب فضل تابش کے گھر کی طرف چل دیے۔ کچھ ہی دیر میں فاروقی صاحب کی سرکاری گاڑی ''شیش محل'' کے سامنے پہنچ کر رک گئی اور ہم گاڑی سے اتر کر اس محل کی سیڑھیوں پر قدم رکھنے لگے۔ سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے ہم نے محل کے ٹھیک سامنے والے پارک میں ایک بلند ستون پر بنے ہوئے شاہین کو بھی دیکھا۔اقبال کا یہ شاہین مشہور مصور سوامی ناتھن نے بنایا ہے۔اور محل کے سامنے سڑک کے بالکل بیچ میں بنا ہوا یہ پارک 'اقبال پارک' کے نام سے مشہور ہے۔ ''شیش محل'' جس میں اس وقت ہم داخل ہو رہے تھے سر راس مسعود کی ملکیت اور اقبال کا مسکن رہا ہے۔مختلف آہنی دروازوں سے ہوتے ہوئے ہم بالآخر اس مقام تک پہنچ گئے جہاں فضل تابش اپنے کنبے

کے ساتھ بالکل روایتی انداز میں رہتے ہیں۔ فضل تابش ہمیں اپنے کمرے میں بٹھا کر اس محل کی تاریخ بتانے لگے۔ اسی بیچ اُن کی بیگم نے میز پر کھانا چن دیا۔ ہم کھانا کھاتے گئے اور بیگم فضل تابش کے کھانا پکانے کے فن کی تعریف کرتے گئے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے کچھ دیر آرام کیا پھر شہر کو دیکھنے بھالنے اور کچھ خریداری کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ فضل تابش نے ہماری رہنمائی کے لیے ایک نوجوان کو ہمارے ساتھ کر دیا۔ بھوپال چونکہ موتیوں کے کام کے لیے مشہور ہے اس لیے ہم نے پرانے شہر کی ایک نمائندہ دکان پر پہنچ کر اس کام کے بہت سے نمونوں کو دیکھنے کے بعد تین ٹکوزیاں خریدیں۔ پھر اسی بازار میں پرانی کتابوں کی ایک دکان کو ڈھونڈنے لگے۔ لیکن تلاش بسیار کے بعد یہ دوکان ہمیں نہیں ملی اور ہم بھارت بھون لوٹ آئے۔ سہ پہر کا اجلاس شروع ہونے میں ابھی کافی دیر تھی۔ ہم بقیہ وقت گزارنے کے لیے بھارت بھون کے اس میوزیم کی سیر کرنے لگے جس میں قبائلی آرٹ کے تمام نمونوں کو بڑے سلیقے اور خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ اس عجائب خانے کی سیر کرتے ہوئے ہم ان چبوتروں کی طرف نکل آئے جن پر صرف چائے کے وقفوں کے دوران ہی آتے تھے۔ یہ چبوترے اس وقت بالکل ویران تھے۔ میں ان ویران چبوتروں پر بیٹھ کر دیر تک فاروقی صاحب کی گفتگو سے مستفید ہوتا رہا۔

کریگ رین

انگلستان: انگریزی

اجلاس کا وقت ہو چکا تھا۔ ہم جلسہ گاہ میں پہنچے تو انگلستان کے جواں سال شاعر کریگ رین (Craig Rain) کے نام کا اعلان ہو رہا تھا۔ کریگ رین کو انگلستان کی

موجودہ شاعری میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عالمی شاعری میں وہ اپنی طنزیہ نظموں اور عشقیہ گیتوں کے لیے مشہور ہیں۔ یوں بھی کریگ رین کا مزاج عاشقانہ ہے۔ اس میلے میں انھیں خوبصورت خواتین کے اردگرد بار بار دیکھا گیا۔ تامل ناڈو سے آئی ہوئی ایسی ہی ایک مشاہد خاتون کو تو انھوں نے کئی بار گلاب کا پھول بھی پیش کیا اور ان خاتون کو کریگ رین کے اس رویے سے دوسروں کے سامنے بے وجہ شرمندہ ہونا پڑا۔

سیاہ ڈاڑھی اور گھنی مونچھوں والے خوبرو کریگ رین آنکھوں پر چوڑے فریم کی عینک چڑھائے ہوئے مائک پر اپنی نظمیں پڑھتے چلے جارہے تھے۔ اچانک بھارت بھون کے منتظمین ایک مہمان شاعر کو انتہائی عزت و احترام کے ساتھ شعرا کی صفوں کی طرف لاتے ہوئے دکھائی دیے۔ سامعین اپنی گردنیں گھما گھما کر اس شاعر کو دیکھنے لگے۔ میرے برابر بیٹھے ہوئے ایک مشاہد نے اس بوڑھے، دراز قد اور نیلی آنکھوں والے شاعر کو دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا:

''اسپنڈر آ گئے''۔

کریگ رین اپنی نظمیں سناتے رہے۔ انھوں نے اپنی دس نظمیں سنائیں۔ جن میں دو عشقیہ گیت "I died the day my husband died" اور ''A temper jealousy'' اور ایک نظم اس صحافی دوست کی یاد میں سنائی جو گولان کی پہاڑیوں میں جنگ کے دوران مارا گیا تھا۔

نظمیں سنانے کے بعد رین نے سامعین سے گفتگو شروع کی۔ سامعین نے اس گفتگو میں زیادہ دل چسپی نہیں لی۔ اجلاس شروع ہونے سے قبل میں نے کریگ رین کو ایک صحافی خاتون اندو مالا سے شاعری میں ہیئت اور مواد کے تعلق پر گفتگو کرتے ہوئے سنا تھا۔ سو میں نے بھی رین سے اس تعلق پر ایک سوال کرلیا۔ لیکن رین میرے سوال کا تشفی بخش جواب نہ دے سکے۔

کریگ رین کی مختصر گفتگو کے بعد محفل برہم ہوئی اور چائے کا دور شروع ہوا۔ چائے پر سب کی توجہ کا مرکز تھے افسانوی شہرت کے حامل اسٹیفن اسپنڈر۔ نڈھال اور تھکے ہوئے۔ وہ آج ہی بھوپال وارد ہوئے تھے اور سفر کی تکان ان کے چہرے سے ظاہر تھی۔

ہربھجن سنگھ
ہندستان : پنجابی

اجلاس کے دوسرے مرحلے کے لیے ہم چائے پی کر واپس اپنی نشستوں پر پہنچ گئے۔ پنجابی کے معروف شاعر ڈاکٹر ہربھجن سنگھ نظم خوانی کے لیے بالکل تیار تھے۔'انٹرنگ' کی فضا آج صبح ہی سے کچھ بوجھل سی تھی۔ روڈ ریگیز اور کریگ رین کی شاعری کو سامعین نے بڑی بے دلی سے سنا تھا لیکن ہربھجن سنگھ نے اپنی پہلی ہی نظم سے سوئی ہوئی بزم کو جگا دیا۔ اُن کی ابتدائی تین نظموں میں سے دو کا تعلق آپریشن بلو اسٹار سے تھا اور ایک نظم ایمر جنسی کے زمانے سے متعلق تھی۔ انھوں نے کل دس نظمیں سنائیں۔

سوال و جواب کے وقفے میں سامعین نے ان نظموں کے حوالے سے اُن پر زبردست حملے کیے۔ ڈاکٹر ہربھجن سنگھ نے ان حملوں کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ میں واقعات و حادثات سے ایک فاصلہ رکھ کر شاعری کرتا ہوں۔ لیکن آپریشن بلو اسٹار نے میری نفسیات اور میرے شاعرانہ رویے کو بالکل بدل دیا۔ جذباتی سطح پر میں اس صورتِ حال کے بہت قریب چلا گیا تھا۔ میری اس کیفیت کے نفسیاتی پہلو کو اقلیت کے ایک فرد کی حیثیت سے ہی سمجھا جا سکتا

ہے۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ پنجاب کے شاعر دہشت گردی اور علاحدگی پسندی کے خلاف ہیں۔

اجلاس کے خاتمے کے بعد ڈاگر برادران (ظہیرالدین ڈاگر۔فیاض الدین ڈاگر) نے دھروپد کی طرز میں مختلف راگوں میں کبیر اور سور کے بھجن گا کر 'انتر نگ' کی شاعرانہ فضا کو غنائیت اور آہنگ سے معمور کر دیا۔

شعر و نغمہ کی یہ محفل ختم ہوئی تو میں فاروقی صاحب کو رخصت کرنے کے لیے بھارت بھون کے صدر دروازے تک ان کے ساتھ آیا۔ وہ آج ہی بھوپال چھوڑ رہے تھے۔ آج ہی مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ ارجن سنگھ کی طرف سے شعرا اور مشاہدین کو رات کے کھانے پر مدعو کیا گیا تھا۔ ارجن سنگھ کی کوٹھی بھارت بھون سے چند قدم کے فاصلے پر ہے۔ ابھی اس کھانے میں بہت وقت تھا۔ اس لیے ہم نے اپنے ہوٹل پہنچ کر دن بھر کی تکان دور کی اور دوبارہ تر و تازہ ہو کر وزیر اعلیٰ کی کوٹھی کی طرف چل دیے۔ یہاں مدھیہ پردیش کے نستعلیق وزیر اعلیٰ Metal Detector سے گزرنے والے ہر شاعر اور مشاہد کا خندہ پیشانی سے استقبال کر رہے تھے۔ نامہ نگار یہاں بھی موجود تھے اور شامیانے کے نیچے بیٹھے ہوئے شاعروں سے سوالات کر رہے تھے۔ وزیر اعلیٰ گھوم گھوم کر اپنے مہمانوں کی تواضع کا جائزہ لے رہے تھے۔ مشاہدین اپنے پسندیدہ شاعروں سے محوِ گفتگو تھے۔ میں ایک کونے میں بیٹھا ہوا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ اشوک باجپئی ہر شاعر اور مشاہد کا نام لے لے کر وزیر اعلیٰ سے اس کا تعارف کرا رہے تھے۔ کھانا شروع ہو چکا تھا۔ میں اپنی پلیٹ میں تلی ہوئی مچھلی کے دو چار قتلے رکھ کر میروسلاو ہولب کے پاس آ گیا اور ان سے ان کی بعض نظموں کا پس منظر معلوم کرنے لگا۔

چوتھی صبح: ۱۴ جنوری
گردوں پہ رنگِ چہرۂ مہتاب فق ہوا

کہرے کی باریک چادر سے جھانکتے ہوئے سورج کی پہلی کرن شاید میرے کمرے کی کھڑکی کے شفاف شیشے پر پڑنے لگی تھی۔ رات میں نے ان کھڑکیوں پر پردے نہیں گرائے تھے۔ اسی لیے میں اس کرن کو صاف دیکھ رہا تھا۔ روشن ہوتی ہوئی صبح نے مجھے بستر سے اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ضروری کاموں سے فارغ ہو کر میں اپنے ناشتے کا انتظار کرنے لگا۔ بہت سے مشاہد ناشتہ کر چکے تھے اور لاؤنج میں بیٹھے ہوئے آپس میں تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔ ہماری بس نے ٹھیک وقت پر آ کر ہارن بجایا اور ہم چوتھے روز کے پہلے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے بس میں بیٹھ گئے۔ بھارت بھون پہنچ کر میں نے کچھ دیر کھلی ہوئی دھوپ کا لطف لیا پھر 'انترنگ' کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ 'واگرتھ' کے برآمدے والے اسٹینڈ پر چاروں طرف لوگ جمع ہیں۔ اس اسٹینڈ پر اسٹیفن اسپنڈر (انگلستان)' سوسوایو (فرانس)، ملیح آنڈے (ترکی)' رابرتو ہواروز (ارجنٹائنا) اور اختر الایمان کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ آج کے اجلاس میں یہی شعرا اپنا کلام پڑھنے والے ہیں۔

میں ہال میں داخل ہوا تو آج بھی اسٹیج کی آرائش بالکل انوکھی تھی۔ سیاہ پردے پر دو حصوں میں بٹا ہوا ایک زرد پردہ لٹکایا گیا تھا جس پر بہت عمدہ کڑھائی کے ذریعے خوبصورت نقش و نگار بنائے گئے تھے۔ اس کا اوپری حصہ مستطیل اور نچلا حصہ تکونا تھا اور اس پر زرد روشنی کا عکس ڈالا جا رہا تھا۔

اجلاس ٹھیک وقت پر شروع ہوا۔ آج مکر سنکرانت تھی اس لیے اِس اجلاس کا آغاز ''سوریہ وندنا'' سے ہوا۔ اشوک باچپئی نے غیر ملکی شعرا کو ہندستان میں مکر سنکرانت کی اہمیت سے آگاہ کیا۔ پھر فرانس کے شاعر پی ایغ اوستیغ سوسوایو (Pierre oster sussouev) سے مائک پر آنے کی درخواست کی۔

پی ایغ او ستیغ سوسوایو

فرانس: فرانسیسی

سوسوایو کے اب تک پانچ شعری اور چھ نثری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ پیرس کے ایک اہم اشاعتی ادارے Seuil کی مجلس مشاورت کے رکن ہیں۔ ۱۹۸۴ء میں انھیں میکس جیکب انعام کی انتخابی جیوری کے ممبر کے طور پر بھی منتخب کیا گیا تھا۔ وہ فرانس کے بحث انگیز اور متنازعہ فیہ شاعر ہیں۔

سوسوایو نے اس اجلاس میں اپنی تین طویل نظمیں سنائیں۔ ان نظموں میں خوبصورت شعری پیکروں کا استعمال کیا گیا تھا۔ ان پیکروں کے ذریعے انھوں نے نہ صرف فطرت کی تصویرکشی کی تھی بلکہ ذات اور کائنات کے ہم آہنگ ہوتے ہوئے پہلوؤں میں زندگی کے معنی ومفہوم کو دریافت کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔

سوسوایو کی نظم خوانی کے دوران 'انترنگ' کی فضا بہت بوجھل ہوگئی تھی۔ اس میں زندگی اُس وقت پیدا ہوئی جب سامعین نے سوسوایو سے مکالمہ شروع کیا۔ فرانس کے اس شاعر سے پہلا سوال یہ کیا گیا کہ وہ اتنی طویل نظمیں کیوں کہتے ہیں۔ جواب میں انھوں نے کہا کہ اب تک میں نے ایک ہی نظم کی تخلیق کی ہے اور یہ نظم ابھی نامکمل ہے۔ میری ہر نظم اسی طویل اور

مسلسل نظم کا ایک حصہ ہے۔ ایک سوال کے جواب میں سوسوایو نے کہا کہ آج کا فرانسیسی شہری بہت عجلت پسند ہے مگر مجھے عجلت کبھی نہیں رہتی اسی لیے میں اتنی طویل نظمیں کہتا ہوں۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ وہ فطرت سے انسان کے مکالمے ہی کو اپنا موضوع کیوں بناتے ہیں اور سماجی اور سیاسی موضوعات پر کیوں نہیں لکھتے تو انھوں نے کہا کہ فرانس میں بہت سے شاعران موضوعات پر لکھ رہے ہیں لیکن وہ روشِ عام سے ہٹے ہوئے ہیں۔

سوسوایو کی گفتگو کے بعد چائے کے وقفے کا اعلان ہوا اور میں چبوتروں پر سجی ہوئی چائے کی میزوں کے قریب جا پہنچا۔ اس وقت اس چبوترے پر لوگ سوسوایو کے بجائے اس اجلاس کے دوسرے شاعر اسٹیفن اسپنڈر کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ حالانکہ اس میلے میں نکانور پارا، ہوا روز اور میروسلا و ہولب جیسے دنیا کے بڑے اور اسپنڈر سے زیادہ اہم شاعر موجود تھے۔ لیکن اپنی افسانوی شہرت کی بنا پر اسپنڈر کا نام بار بار ہماری زبانوں پر آ رہا تھا اور ہم ان کا کلام سننے کے مشتاق تھے۔

اسٹیفین اسپنڈر
انگلستان : انگریزی

۸۰ سالہ اسٹیفین اسپنڈر اپنے فن اور شخصیت کے اعتبار سے اس عہد کے درمیانی دہوں کے انتہائی اہم اور خطر پسند شاعر ہیں۔ ان کی مشہور سوانح عمری ''جہاں اندر جہاں'' کا

مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی میں کن کن نشیب و فراز سے گزرے ہیں۔ بچپن میں انھیں مصور بننے کا شوق تھا جو پورا نہ ہو سکا۔ ۱۷ سال کی عمر میں گزر اوقات کے لیے انھوں نے کیمیاوی دوائیں تیار کرنے والے کارخانوں کے لیے لیبل چھاپنے کا کام کیا۔ ۱۹ سال کی عمر میں اسپنڈر نے خود اپنا پریس قائم کیا اور اپنی نظموں کا پہلا مجموعہ ''نو تجربے'' شائع کیا۔ آکسفورڈ میں آڈن، میک نیس اور سی۔ ڈے لیوس کی رفاقت نے ان کی شاعری کے لیے صیقل کا کام کیا۔ انھوں نے کمیونسٹ پارٹی میں بھی شمولیت اختیار کی لیکن Regimentation کی پالیسی سے برگشتہ ہو کر وہ جلد ہی اس سے الگ ہو گئے۔

کئی شعری مجموعوں کے خالق ...ن اسٹیفین اسپنڈر اس وقت ہمارے سامنے کھڑے تھے اور کریگ رین سے کسی ادبی نکتے پر گفتگو کر رہے تھے۔ بھارت بھون کی کارکن خواتین انھیں اپنے حلقے میں لیے ہوئے ان کی تواضع کر رہی تھیں۔ جھیل کی طرف سے آتی ہوئی ہوائیں اسپنڈر کی پیشانی پر پڑے ہوئے سفید بالوں میں جنبش پیدا کر رہی تھیں اور اسپنڈر ان جنبشوں سے بے نیاز 'انترنگ' کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔

'انترنگ' میں اجلاس کے دوسرے مرحلے کے آغاز کا اعلان ہوا اور معمولی لباس میں ملبوس شاعروں کی صفوں سے ایک لمبے قد والا بوڑھا نمودار ہوا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے پر سپاہیانہ تیور اب بھی موجود ہیں اور عمر کی اس منزل میں بھی اس نے شکست تسلیم نہیں کی ہے۔ ہم سب کی نگاہیں اسی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ مائک کی طرف فاتحانہ شان سے بڑھتا ہوا یہ بوڑھا شخص تھا دنیا کا معروف و ممتاز شاعر اسٹفین اسپنڈر۔ اسپین کی خانہ جنگی میں بین الاقوامی بریگیڈ کے رکن کی حیثیت سے دوسری جنگِ عظیم کی ہولنا کیوں کو بہت قریب سے دیکھنے والے اس شاعر نے اپنی نظم خوانی کا آغاز ہی ایک ایسی نظم سے کیا جو دوسری جنگ عظیم پر لکھی گئی تھی۔ اس نظم کا عنوان تھا: ''جنگ کا سایہ''۔

اپنی نظموں کے انتخاب میں اسپنڈر نے زمانی ترتیب کا خاص لحاظ رکھا تھا تا کہ سننے والوں کو ان کے کلام میں عہد بہ عہد رونما ہونے والی تبدیلیوں کا اندازہ ہو سکے۔ ان نظموں میں انھوں نے وہ تین نظمیں بھی پڑھیں جو اپنی بہن مارگریٹ کی یاد میں کہی تھیں۔ مارگریٹ

کا انتقال ۱۹۴۵ء میں عین کرسمس کے روز ہوا تھا اور اسپنڈر نے اپنی بہن کی موت سے متاثر ہو کر ''مارگریٹ کا مرثیہ'' کے عنوان سے کئی نظمیں کہی تھیں۔

ڈھلتی ہوئی عمر کا یہ شاعر جو اس وقت سامعین کی نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا اب اپنی تیس سال قبل کی ایک نظم The pylons پڑھ رہا تھا:

ان پہاڑوں کا راز پتھر تھا
اور پتھر سے بنی ہوئی جھونپڑیاں
اور یہ ٹوٹتی ہوئی سڑکیں
جو اچانک
ان دیہاتوں کی طرف مڑ جاتی تھیں
جو آنکھوں سے اوجھل تھے۔

اسپنڈر کی ایک مختصر نظم ''موضوع، معروض، جملہ'' کو سامعین نے بہت پسند کیا۔

گفتگو کے وقفے میں جب اسپنڈر سے ہندستان کے انگریزی مصنفین کی ادبی حیثیت کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ انگریزی سے ہندستانیوں کا عشق قابل رحم ہے۔ اس ملک میں انگریزی کی المناک صورت حال کو بیان کرتے ہوئے اسپنڈر نے کہا کہ ہندستانی انگریزی میں سفر کرنے کی صلاحیت نہیں ہے اور اس کا عالمی انگریزی کے سامنے ٹکنا مشکل ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادبی دنیا میں ہندستان کا کوئی بھی انگریزی کا مصنف اس وقت تک اپنے قدم نہیں جما سکتا جب تک وہ ہندستان چھوڑ نہ دے۔ لیکن جس طرح لاطینی کے تئیں یورپ والوں کی محبت مجھے اچھی لگتی ہے اُسی طرح انگریزی سے ہندستان کی محبت بھی مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ اسپنڈر نے انگریز ذہن کے احساس برتری کا مکمل مظاہرہ کرتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں کہا کہ جب میں ۱۹۶۱ء میں ہندستان آیا تھا، اس وقت بھی کوئی مصنف اچھی انگریزی نہیں لکھ رہا تھا اور آج بھی وہی صورت حال ہے۔ کل ہی میں نے انگریزی کے استاد اور بنگلہ کے نوجوان ادیب سبودھ سرکار سے جب یہ پوچھا تھا کہ وہ انگریزی میں کیوں نہیں لکھتے تو انھوں نے کہا تھا کہ ''انگریزی میں لکھ کر میں کوئی مقام نہیں بنا سکتا۔ ہندستان

میں جو لوگ انگریزی میں لکھ رہے ہیں وہ ابھی تک انگریزی ادب میں اپنی کوئی شناخت نہیں بنا سکے ہیں۔'' اسپنڈر کی اس گفتگو کے دوران میں نے مشاہدین کی صف میں سبودھ کو تلاش کیا لیکن وہ کہیں اور بیٹھے ہوئے تھے۔

جھجک جھجک کر پوچھے جانے والے ان سوالوں کے دوران میں بھی اپنی جگہ سے اٹھا اور ڈرے ہوئے لہجے میں اس قد آور شاعر سے میں نے بھی یہ پوچھ لیا کہ شاعری کے رجحانوں اور نظریوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں (اور جن میں سے بہت سی تبدیلیوں کو خود آپ نے متاثر کیا ہے) اُن سے خود آپ کی شاعری کہاں تک متاثر ہوئی ہے؟ جواب میں اسپنڈر نے کہا کہ ''میں کسی تبدیلی سے متاثر نہیں ہوا۔ میری شاعری میں یہ تبدیلیاں خود بخود رونما ہوئی ہیں۔ میں نے رجحان اور نظریے کی پروا کیے بغیر شاعری کی ہے''۔

کھرے، تیکھے اور دوٹوک جوابوں سے سامعین کی صفوں کو تہ و بالا کر دینے کے بعد اسپنڈر نے پانی سے بھرا ہوا گلاس اپنے ہونٹوں سے لگایا اور واپس اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئے۔

ملیح سوِدیت اندے
ترکستان: ترکی

صبح کے اجلاس کے تیسرے شاعر کی حیثیت سے مائک پر آئے ترکی کے ملیح سوِدیت اندے (Cevdet Andey Melih) انھوں نے اپنی طویل نظم ''ٹرائے سے قبل گھوڑے''

کے تین حصے پڑھے۔ اس نظم میں گھوڑے کی علامت کے ذریعے تاریخ کے معنوی ارتقا کی جستجو کی گئی تھی۔ ملیح کی بقیہ نظموں میں بھی زندگی کے بنیادی مفہوم کی تلاش کے ساتھ ساتھ روایت اور تہذیب سے فرد کے تفاعل اور زمانے کی مختلف نوعیتوں کی وضاحت کی گئی تھی۔

ملیح بیمار اور تھکے ہوئے تھے اس لیے انھوں نے سامعین سے مکالمہ کرنے سے معذرت کر لی۔ ترکی کے شاعر کی اس معذرت کے بعد محفل برخاست ہوگئی۔ آرام و طعام کا یہ طویل وقفہ ہم نے بھارت بھون کی کینٹین میں اپنے بزرگ دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر گذارا۔ اس وقت کینٹین میں ساری میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگ ہندستانی انگریزی کے متعلق اسپنڈر کے فقروں پر گفتگو کر رہے تھے۔ انھیں میزوں میں سے ایک پر سبودھ بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی میز پر پہنچ کر جب اس سے یہ کہا کہ کل جو کچھ تم نے ہندستانی انگریزی کے بارے میں کہا تھا آج اسپنڈر نے اس کی تصدیق کر دی تو وہ ناراض ہوتے ہوئے بولا: ''لیکن اسپنڈر اب بھی یہی سمجھتا ہے کہ وہ ایک انگریز ہے اور ہندستانیوں سے ہم کلام ہے''۔ میں نے سوچا کہ سبودھ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ اسپنڈر کی گفتگو میں برتری کا یہ احساس کسی کو پسند نہیں آیا۔

کینٹین میں باتیں کرتے کرتے چار بج گئے۔ سہ پہر کے اجلاس کا وقت ہوگیا۔ لوگ بھارت بھون میں آنا شروع ہوگئے تھے۔ ہم اس اجلاس کے پہلے شاعر رابرتو ہواروز کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے 'واگرتھ' کی طرف بڑھنے لگے۔ اس میلے میں تین چار شاعر شروع ہی سے موضوعِ گفتگو بنے ہوئے تھے اور ہواروز ان میں سے ایک تھے۔

رابرتو ہواروز
ارجنٹائنا: ہسپانوی

ارجنٹائنا کے رابرتو ہواروز اپینی زبان میں شاعری کرتے ہیں اور عالمی شاعری میں اپنی عمودی نظموں کے لیے مشہور ہیں۔ انکا تعلق لائبریری اور انفارمیشن سائنس سے ہے۔ اس میدان میں انھوں نے نمایاں کارنامے انجام دیے ہیں۔ اسی سلسلے میں وہ کوسٹاریکا اور مڈیلن میں وزیٹنگ پروفیسر بھی رہے ہیں۔ ہواروز کی عمودی نظموں کے تقریباً ۱۳ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی نظموں کے ترجے فرانسیسی' جرمن، اطالوی، پرتگالی، یونانی، ڈینش، ڈچ، ہندی، عربی اوردوسری کئی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ۱۹۷۷ء میں انھیں ارجنٹائنا کا ''فاؤنڈیشن فارپوئٹری'' کاسب سے بڑا انعام بھی مل چکا ہے۔

'انترنگ' سامعین سے چھلک رہا تھا۔ آنکھوں پر تاریک شیشوں کی عینک چڑھائے ہوئے ہواروز مائک پرآچکے تھے۔ چوڑی پیشانی، ستواں ناک، سر کے آدھے بال غائب۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس گلے میں کالا اسکارف باندھے ہوئے ہواروز نے اپنی مختصر اور بے عنوان نظمیں پڑھنا شروع کیں۔ ان علامتی اور تجریدی نظموں میں کفایتِ الفاظ کا خاص لحاظ رکھا گیا تھا اوران کی زبان سادہ اور عام بول چال کی زبان تھی۔ ہواروز اپنی سادہ بیانی میں زبردست

معنویت پیدا کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ موت، زندگی، خدا اور زمان و مکان ہواروز کے محبوب موضوع ہیں:

چیزوں کی تہہ
نہ تو زندگی ہے نہ موت
میرا ثبوت ہے
وہ ہوا جو پرندوں کے اندر برہنہ پا جاتی ہے
غُنچوں کی چھت
جو خاموشیوں کے لیے جگہ نکالتی ہے
(اور)
میری یہ نگاہ
جو تہہ کی طرف مڑ جاتی ہے
جس طرح آخرکار ہر شے مڑ جاتی ہے

اپنی نظموں کو پوری دل جمعی کے ساتھ پڑھنے کے بعد ہواروز نے سامعین سے بات چیت کرتے ہوئے سلاستِ بیان کے سلسلے میں کہا کہ سچائی اور حقیقت کو گرفت میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ مرصّع سازی سے گریز کیا جائے۔ میں کبھی مرصع سازی کے چکر میں نہیں پڑا۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ مجھے بچپن ہی سے مشرقی فلسفے سے بڑی محبت رہی ہے اسی لیے میرے ذاتی فلسفے اور بدھ فلسفے کے درمیان بہت سے مشترک پہلو ہیں۔ ہواروز کے اس کلیے کے باوصف کہ ''شاعری موت سے مجادلہ ہے'' ان کی نظموں میں موت کی ناگزیری اور وجود کے اضطراب وغیرہ موضوعات کی تکرار کبھی کبھی کھٹکنے لگتی تھی۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ آپ محض تخئیلی شاعر ہیں اور سماجی حقائق سے آپ کا کوئی تعلق نہیں ہے تو انھوں نے کہا کہ شاعر کوئی فرشتہ نہیں ہوتا۔ دوسرے عام انسانوں کی طرح وہ بھی روزمرّہ کے مسائل سے دوچار ہوتا ہے اور اس کی زندگی کے بھی کچھ سماجی پہلو ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کی شاعری کو اسی پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے۔

مزاح کی آمیزش لیے ہوئے ہواروز کے دل چسپ جوابوں نے سامعین کو بہت محظوظ کیا۔ انھوں نے بلاشبہ سامعین سے بہت عمدہ اور کامیاب گفتگو کی۔ ان کی ترجمانی کے فرائض خود ان کی بیوی نے انجام دیے جنھوں نے بڑے شیریں اور دلآویز انداز میں ہواروز کے فوری جوابوں کو بڑی روانی سے انگریزی میں منتقل کیا۔

چائے کے وقفے میں ہواروز ہی مرکزی شخصیت تھے۔ مشاہدین اور نامہ نگار انھیں اپنے حلقے میں لیے ہوئے ان کی عمودی نظموں کے متعلق گفتگو کر رہے تھے۔ ہواروز یہاں بھی سب کے سوالوں کے موزوں اور مختصر جواب دے رہے تھے اور یہاں بھی ان کی اہلیہ ہی ان کی ترجمانی کر رہی تھیں۔

اختر الایمان
ہندستان: اردو

اجلاس کا دوسرا مرحلہ تھا اختر الایمان کی نظم خوانی۔ اور میں بالکل اردو مشاعروں کے سامعین کے انداز میں سوچ رہا تھا کہ ہواروز کے محفل لوٹ لینے کے بعد اختر الایمان جم سکیں گے۔ میں ہی نہیں دوسرے لوگ بھی یہی سوچ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اختر الایمان کے نام کا اِعلان ہوا اور وہ سفید کرتے پائجامے اور سرمئی رنگ کی صدری میں ملبوس اپنی منتخب نظموں کے ساتھ مائک پر آگئے اور اپنی پہلی نظم پڑھنا شروع کی: ''قدرِ مشترک''۔ چاروں

طرف سے واہ واہ بلند ہونے لگی۔ اور جب انھوں اپنی مشہور نظم ''ایک لڑکا'' پڑھنا شروع کی تو گویا ایک سماں باندھ دیا۔ نظم ختم ہوئی تو ہر طرف سے توصیفی صدائیں آنے لگیں۔ اختر الایمان ایک کے بعد ایک اپنی نظمیں پڑھتے گئے: ''تبدیلی''، ''سبزۂ بیگانہ''، ''اِتفاق''، ''ڈاسنا اسٹیشن کا مسافر''۔۔۔ مجمع نعرہ ہائے تحسین بلند کرتا رہا۔ ان میں سے کچھ نظموں کے انگریزی ترجمے پیش کیے اشوک باجپئی نے۔ اوران ترجموں کے ذریعے غیر ملکی شعرا نے بھی اختر الایمان کے موضوعات کی ستائش کی۔

کلام کی داد و تحسین کے بعد سامعین سے مکالمے کا آغاز ہوا۔ سوالوں کا سلسلہ ہندی میں شروع ہوا اور جب اختر الایمان نے ان کے جواب انگریزی میں دیے تو سامعین نے اس پر احتجاج کیا اور کہا کہ ہندی میں پوچھے جانے والے سوالوں کے جواب بھی ہندی ہی میں دیے جائیں۔ اختر الایمان ان سوالوں کے جواب انگریزی میں اس لیے دے رہے تھے تاکہ مہمان شعرا بھی اس گفتگو کو سمجھ سکیں۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ وہ ہندو پاک کی اردو شاعری میں کوئی امتیاز کرتے ہیں اور یہ کہ ایک ہی طرح کے سماجی اور تہذیبی اقدار کے باوجود دونوں جگہ کی شاعری ایک دوسرے سے مختلف کیوں ہے تو اختر الایمان نے کہا کہ میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ امتیاز و اختلاف کا فیصلہ آپ خود کریں۔ سامعین اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئے اور بات چیت کے اس محل پر ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سامعین کا اصرار تھا کہ اختر الایمان اس موضوع پر اپنی زبان کھولیں اور اختر الایمان نے اظہار خیال کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ انکار و اصرار کی اس تکرار میں صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ایک گروہ اختر الایمان کو پریشان کرنے کے لیے اپنے ہر سوال کو وقار کا مسئلہ بنانے پر تُلا ہوا ہے۔ بعض اعتدال پسند مشاہدین نے ہندو پاک کی شاعری سے متعلق سوال ہی کو مہمل قرار دیا اور کہا کہ بہتر ہوگا کہ ہم اختر الایمان کی نظموں ہی پر گفتگو کریں۔ بہر حال اشوک باجپئی کی خوش تدبیری نے اس تنازعے کو ختم کر دیا اور سوالات کا سلسلہ آگے چل نکلا۔ انھیں سوالوں میں ایک دو سوال میں نے بھی کر لیے۔ جب ایک سامع نے اختر الایمان سے یہ پوچھا کہ ان کی فلمی تحریروں نے ان کی شاعری پر کوئی منفی اثر ڈالا ہے تو انھوں نے اس کا جواب نفی میں دیا۔

مکالمے کو متنازعہ بنا دینے والی اس گرما گرم بحث کے بعد شام کا یہ اجلاس ختم ہوا۔
اسی اجلاس میں چین کی شاعرہ شوتنگ نے بھارت بھون کی جزوی مالی امداد سے مختلف ہندستانی زبانوں میں شائع ہونے والے چودہ رسالوں کے اجرا کی رسم بھی ادا کی۔
اجلاس ختم ہوتے ہوتے اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں اختر الایمان کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہوئے ہال سے باہر نکلا اور تھوڑی ہی دیر میں اپنے ہوٹل پہنچ گیا۔ کھانے وغیرہ سے فرصت پا کر میں دوسرے مشاہدین سے آج کے اجلاسوں پر دیر تک گفتگو کرتا رہا اور رات کے آخری پہر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا آیا۔

پانچویں صبح: ۱۵ر جنوری
در کھُل گیا سحر کا ہوا بند بابِ شب

پرندوں نے درختوں کی شاخوں پر بولنا شروع کر دیا تھا۔ آنکھ کھلتے ہی میں نے سمجھ لیا کہ مہتاب پردۂ فلک کے پیچھے جا چکا ہے۔ دو۔ چار کروٹیں بدل کر میں بستر سے اٹھا اور طلوعِ صبح کا منظر دیکھنے کے لیے کھڑکی کے پٹ کھول دیے۔ آفتاب کنارۂ افق سے دھیرے دھیرے نمودار ہو رہا تھا۔ نیند اب بھی میری آنکھوں میں بھری ہوئی تھی لیکن اجلاس میں ٹھیک وقت پر پہنچنے کی غرض سے میں صبح کے معمولات انجام دینے لگا۔ بس نے حسبِ سابق ٹھیک وقت پر آ کر ہارن بجایا اور مشاہدین جلدی جلدی اپنے کمروں سے نکل کر اس کی طرف بھاگنے لگے۔ ان چار دنوں میں ہم مشاہدین آپس میں خوب گھل مل گئے تھے۔ ایک دوسرے کے تئیں ہماری جھجک ختم ہو چکی تھی۔ اب ہم جہاں بیٹھتے خوش گپیاں کرتے، موقع ملتے ہی ایک دوسرے پر جملے کستے، دل کھول کر ہنستے اور کسی کسی کو مذاق کا موضوع بھی بنا لیتے۔ اس وقت بھی چلتی ہوئی بس میں ہم میں سے ایک مشاہد مذاق کا موضوع بنے ہوئے تھے اور ہم کسی برجستہ جملے پر قہقہے لگا رہے تھے۔ انھیں قہقہوں کے درمیان بس بھارت بھون پہنچ گئی اور ہم ۱۵ر جنوری کی صبح کے پہلے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے 'انترنگ' میں داخل ہونے لگے۔
مدعو شعرا کے استقبال کے لیے آج 'انترنگ' کے اسٹیج کی آرائش ایک دوسرے کے

گرد حلقہ بناتے ہوئے تین سیاہ چوکور پردوں کے ذریعے کی گئی تھی۔ ان میں سے ہر پردے کا رنگ اپنے پہلے والے پردے کے رنگ سے زیادہ گہرا تھا۔ پردوں کے درمیان فاصلے کے تناسب نے اس پوری آرائش میں ایک حسن پیدا کر دیا تھا۔ روز کی طرح آج بھی شاعروں اور مشاہدوں کی نشستوں میں تبدیلی کر دی گئی تھی۔ ہال رفتہ رفتہ سامعین سے بھرتا جا رہا تھا۔ میری نگاہ سیاہ پردوں سے ہوتی ہوئی شاعروں کی نشستوں پر آ کر ٹھہر گئی۔ ابھی میں آنے والے شعرا کا شمار کر ہی رہا تھا کہ اشوک باچپئی نے مائک پر آ کر آج کے اجلاسوں کی تفصیل بیان کی اور یہ خوش خبری بھی دی کہ چلی کے صفِ اوّل کے شاعر نکانور پارا بھوپال پہنچ چکے ہیں اور اجلاس میں بہ نفسِ نفیس موجود ہیں۔ اس خوش خبری پر سامعین میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور خوشی کے انھیں لمحوں میں اس اجلاس کے پہلے شاعر کو شعر خوانی کی دعوت دی گئی۔

فیرینتس یوہاش
ہنگری: ہنگرین

گٹھا ہوا جسم، بھرا ہوا چہرہ، گول سیاہ آنکھیں چھوٹی سی ابھری ہوئی ناک، بالوں سے پوری پیشانی ڈھکی ہوئی۔ یہ تھے ہنگری کے فیرینتس یوہاش جو اپنے کم عمر اور خوبرو ترجمان کے ساتھ مائک پر آئے۔ پہلے انھوں نے مختصراً اپنا شعری نظریہ بیان کیا اور پھر اپنی تین طویل نظموں میں سے پہلی نظم ''بارہ سنگھا بن جانے والا لڑکا باب الاسرار پر کھڑا روتا ہے'' پڑھنا شروع کی۔ اس نظم کے پہلے حصے میں ایک ماں جنگل میں گئے ہوئے اپنے بیٹے کو طرح طرح کی مِنتیں کر کے واپس بلاتی ہے۔ دوسرے حصے میں بیٹا ان مِنّتوں کے جواب میں واپس آنے سے صاف انکار کر دیتا ہے۔ تیسرے حصے میں ماں پھر اسے طرح طرح کے واسطے دیتی ہے لیکن بیٹا کہتا ہے کہ اب میں صرف مرنے کے لیے آؤں گا۔ ماں بیٹے کو اس طرح بلاتی ہے:

آ جا مرے بیٹے آ جا
میں، تری ہی ماں تجھے پکار رہی ہوں
آ جا مرے بیٹے آ جا
میں، ترا خنک چشمہ تجھے پکار رہی ہوں
آ جا مرے بیٹے آ جا
میں، تری یادوں والی چھاتی تجھے پکار رہی ہوں
آ جا مرے بیٹے آ جا
میں، ترا اجڑا ہوا خیمہ تجھے پکار رہی ہوں
آ جا مرے بیٹے آ جا
میں، ترا گل ہوتا ہوا چراغ تجھے پکار رہی ہوں
بیٹا ان منتوں کا جواب اس طرح دیتا ہے:
ماں مری ماں
میں لوٹ نہیں سکتا
مجھے مت بہلاؤ
ماں مری ماں
مجھے پالنے والی مری پیاری انا
ماں مری ماں
میرے میٹھے ابلتے ہوئے چشمے
مجھے آغوش میں لینے والے محفوظ ہاتھوں
(ماں) جس کی بھاری چھاتیوں نے مجھے دودھ پلایا
میرے خیمے، سردیوں میں مجھے پناہ دینے والی
ماں مری ماں
میرے آنے کی راہ مت دیکھ
اس نظم نے اپنی فنتاسی کی بنا پر عالمی شہرت حاصل کی تھی اور بقول شاعر آڈن نے اس نظم کو اپنے زمانے کی عظیم ترین نظم قرار دیا تھا۔

یوہاش نے اپنی لمبی نظموں کے کچھ ہی حصے پڑھ کر سنائے۔ ان کی نظموں میں دیہی تہذیب اور زندگی کے جیتے جاگتے مرقعے پیش کیے گئے تھے اور اس بات پر شدید تشویش اور افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ شہری تہذیب کی لعنتیں دیہات کی معصومانہ فطرت کو آلودہ کر رہی ہیں۔ یوہاش نے ان نظموں میں سماجی تضادات اور انسانی رشتوں کے کھوکھلے پن کو بے نقاب کیا تھا۔ اساطیر اور تلمیحات سے اخذ کی ہوئی ان علامتوں کے ذریعے انھوں نے نہ صرف جدید تہذیب کی بدبختیوں کو پیش کیا تھا بلکہ اس مشینی عہد میں انسان کے بڑھتے ہوئے خوف اور تحفظ کے احساس کی بھی خوبصورت عکاسی کی تھی۔ یوہاش انسان کی باہری دنیا (فطرت) کو آئینہ بنا کر اس کی اندرونی دنیا کی تصویر پیش کرتے ہیں۔

مکالمے کی خوشگوار ساعتوں میں جب بھارت بھون میں 'انتر بھارتی' کے ڈائریکٹر کرشن بلدیو وید نے یوہاش سے سوال کیا کہ کیا ان کی نظم کا کوئی اساطیری پس منظر ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ یہ نظم میں نے ۱۹۵۶ء میں ہنگری کے مشہور موسیقار بیلا بارتھو کی موت سے متاثر ہو کر کہی تھی۔ اس کی تخلیق کا محرک فطرت کے متعلق بیلا بارتھو ہی کا ایک قول ہے۔ یہ نظم در اصل اس عظیم موسیقار کو خراجِ عقیدت ہے۔ انھوں نے کہا کہ بیلا بارتھو کے قول سے متاثر ہونے کے باوجود میرے اور بارتھو کے نظریے میں فرق ہے۔ بارتھو فطرت کی طرف واپسی کے قائل تھے اور میرا نظریہ یہ ہے کہ فطرت میں شامل رہنے کے باوجود انسان میں اس سے باہر نکلنے کی بھی قوت ہونی چاہیے۔ میں فطرت سے باہر ایک بہتر انسان کی تخلیق میں یقین رکھتا ہوں۔ یوہاش نے کہا کہ مظاہر فطرت بہ زبانِ خاموشی ہم سے مطالبہ کرتے ہیں کہ ہمیں گویائی عطا کرو۔ ایک سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ شاعری بے جان چیزوں سے بھری ہوئی شیر کی کھال نہیں ہے۔ میں ایک ایسی نظم لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں جس میں ذات اور کائنات کے مظاہر عظیم شاعرانہ حسّیت کے ساتھ منعکس ہو سکیں۔ شاعری میں تخلیقی محرکات پر گفتگو کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس میلے سے ایک ہفتہ قبل ہی میری ماں کا انتقال ہو گیا تھا اور ان کی تدفین بھی کسی کارِ تخلیق سے کم نہ تھی۔ چلی کے شاعر نکانور پارا کے یہ پوچھنے پر کہ کیا حقیقی زندگی میں ان کا کوئی لڑکا مرا ہے، انھوں نے کہا کہ اسے میری خوش قسمتی سمجھیے یا بدقسمتی کہ

میری صرف تین لڑکیاں ہیں۔

یوباش کی نظموں کا انگریزی ترجمہ ڈینیل لائس نے اور ہندی ترجمہ رگھوویر سہائے نے پیش کیا۔ یوباش کے نوجوان اور خوش شکل ترجمان ڈاکٹر امرے لازار نے اپنے شیریں اور فصیح لہجے سے سامعین کو مسحور کر دیا۔ لازار ہندستان میں ہنگری کے سفارت خانے میں فرسٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز ہیں۔

فیرینتس یوباش کی طویل نظموں کے بعد چائے کے مختصر وقفے میں صحافیوں نے یوباش کے بجائے ڈاکٹر امرے لازار کو گھیر لیا اور ان سے یوباش کی نظموں میں مستعمل اساطیری الفاظ و علامات پر گفتگو کرنے لگے۔ لازار شائستہ کلامی کے ساتھ ان استفسارات کا جواب دیتے رہے اور چبوترے پر کھڑے ہوئے لوگ حلقہ بنائے ہوئے اس ترجمانِ خوش بیان کی باتیں سنتے رہے۔ اسی دوران اجلاس کے دوسرے مرحلے کا اعلان ہوگیا۔
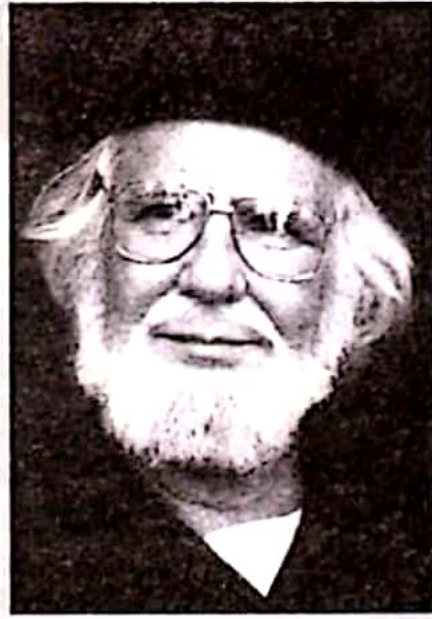
ارنستو کاردینال
نکاراگوا: ہسپانوی

نکاراگوا کے ارنستو کاردینال کی نظم خوانی کا ہم پہلے ہی روز سے انتظار کر رہے تھے اور اس وقت مائک پر انھیں کا نام لیا جا رہا تھا۔ مجمع انھیں سننے کے لیے بے چین تھا۔ خوش رو اور

بزلہ سنج کارڈینال اس وقت دنیا کے اہم ترین شاعروں میں سے ایک ہیں۔

اشتراکی نظریے کے پیرو، سامراجی نظام اور ریگن انتظامیہ کے کٹر مخالف، نکاراگوا کے کمیونسٹ انقلاب کے گوریلا سپاہی اور انقلاب کے بعد نکاراگوا کے مقبول ترین وزیر ثقافت ۶۳ سالہ ارنستو کارڈینال پیشے سے پادری ہیں۔ کولمبیا یونیورسٹی میں امریکی ادب کا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۱ء تک پادری کی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۶۵ء میں وہ مانا گوا کے پادری مقرر ہوئے۔ ۱۹۸۰ء میں انھیں مغربی جرمنی کے تاجرانِ کتب کی جانب سے ''امن انعام'' سے نوازا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں انھیں نکاراگوا کی حکومت کا اعلیٰ ترین اعزاز ملا۔ ۱۹۸۵ء میں انھیں اسی حکومت کے ایک دوسرے اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا گیا۔

ری او یونیورسٹی (برازیل) گریناڈا اور ویلنسیا یونیورسٹی (اسپین) اور مڈیلین، کولمبیا کی لاطینی امریکی یونیورسٹی نے انھیں ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں تفویض کیں۔ حکومتِ فرانس نے انھیں ''آرڈر آف نائٹ کمانڈرانِ آرٹس'' کا سا اہم اعزاز عطا کیا۔

کم و بیش دس شعری مجموعوں کے خالق ارنستو کارڈینال جب مائک پر آئے تو 'انتر نگ' میں دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔

نیلی قمیص اور جینس میں ملبوس آنکھوں پر عینک اور سر پر فیلٹ ہیٹ لگائے ہوئے کارڈینال نے مسکراتے ہوئے سامعین کو دیکھا اور گویا ہوئے: ''پادری ہونے سے قبل میں نے کچھ رومانی نظمیں بھی کہی تھیں لیکن نکاراگوا کے انقلاب کے بعد میں صرف انقلابی شاعری کرتا ہوں۔''

گول چہرے اور سفید ڈاڑھی والے کارڈینال نے اپنے مخصوص لہجے میں ایک درجن سے زائد نظمیں سنائیں۔ ان نظموں میں نوکرشاہی، سرمایہ داری اور اسٹیبلشمنٹ کے خلاف زبردست احتجاج موجود تھا۔ انھوں نے بعض نظموں میں نئی تہذیب کے تضادات اور اس سے پیدا ہونے والے انتشار کو بھی موضوع بنایا تھا۔ جذبات کی شدت اور موضوعات کی وسعت کے باوجود ان نظموں میں شعری اور جمالیاتی عنصر کی کمی محسوس ہوتی تھی۔

کارڈینال کی تقریباً ہر نظم پر نکاراگوا کے انقلاب کا سایہ موجود تھا۔ ان کی نظم ''طوطے'' میں یہ سایہ زیادہ واضح ہو گیا تھا:

میرا دوست مائیکل

ہونڈرن سرحد کے قریب سوموٹو میں ایک فوجی افسر ہے
اور اس نے مجھے بتایا کہ اُس نے کچھ ایسے طوطے پکڑے تھے
جن کا سرحد کے پار لے جانا ممنوع ہے
یہ طوطے انگریزی سیکھنے کے لیے
امریکہ منتقل کیے جانے والے تھے
کُل ۱۸۶ طوطے تھے جن میں سے ۱۴۷ اپنے پنجروں کے اندر ہی مر چکے تھے
اُس نے انھیں وہیں پہنچا دیا جہاں سے وہ لائے گئے تھے
لاری جیسے ہی پہاڑوں کے دامن میں پھیلے ہوئے میدانوں میں پہنچی
جہاں ان طوطوں کے آشیانے تھے
تو یہ طوطے بےچین ہو گئے۔ اپنے پروں کو پھڑ پھڑانے
پنجرے کی دیواروں سے ٹکرانے لگے
اور جیسے ہی پنجروں کو کھولا گیا
یہ سب تیر کی طرح باہر نکلے اور
سیدھے اپنے آشیانوں کی طرف پرواز کر گئے
میں سمجھتا ہوں انقلاب نے بھی ہمارے ساتھ بالکل یہی کیا ہے
اُس نے ہمیں ان پنجروں سے چھڑایا ہے
جن میں ہم کو انگریزی بولنے کے لیے قید کیا گیا تھا
اس نے ہمیں ہمارا وطن
جہاں سے ہم بے گھر کیے جا چکے تھے، پھ ایا
طوطوں کو سبز انقلابیوں کے ذریعے
اپنے سبز پہاڑ واپس مل گئے
لیکن
ان طوطوں میں ۱۴۷ تھے جو مر گئے۔

سوالات کے وقفے میں سامعین نے کارڈینال پر سوالوں کی بوچھار کردی۔ مجمع میں سے بیک وقت کئی ہاتھ بلند ہوتے اور اشوک باجپئی کے لیے یہ مشکل ہو جاتا کہ پہلے کسے موقع دیا جائے۔ ان بہت سے سوالوں کے جواب دیتے ہوئے دنیا کے نہایت محترم اور ہردلعزیز شاعر نے کہا کہ میرے نزدیک انقلاب ہی شاعری ہے اور شاعری ہی انقلاب۔ نکاراگوا کے انقلاب نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ادب ہی سماجی تبدیلی کا وسیلہ ہے اور اسی کے ذریعے انقلاب ممکن ہے۔ جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ آپ پادری اور شاعر میں توازن کیسے قائم کرتے ہیں تو انھوں نے کہا کہ نکاراگوا میں انقلاب کے دوران عوام کو ادب سے قریب تر کرنے کے لیے کسانوں، مزدوروں، سپاہیوں اور طلبہ کے لیے شاعری کے مکتب قائم کیے گیے ہیں جس کے نتیجے میں نکاراگوا کے عوام میں شاعری کا شوق پیدا ہوا ہے اور اب نئی شاعری انھیں مکتبوں میں تخلیق کی جارہی ہے۔ نکاراگوا کے انقلاب کے بارے میں دریافت کیے جانے پر انھوں نے کہا کہ نکاراگوا کے عوام کے سامنے دو ہی راستے تھے: انقلاب یا امریکہ پر انحصار۔ سو ہم نے انقلاب کا راستہ پسند کیا۔ جب ان سے یہ کہا گیا کہ نکاراگوا میں بہت سے شاعر جمہوریت اور انقلاب کے خلاف شاعری کررہے ہیں تو انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ حکومت ان شاعروں کو اپنے خلاف لکھنے کی مکمل آزادی دیتی ہے۔ اسی ضمن میں جب نکاراگوا کے ایک حکومت مخالف اخبار 'لاکنسا' پر سنسر شپ لگائے جانے اور اس کی اشاعت روک دیے جانے کے سلسلے میں سوال کیے گئے تو کارڈینال نے بڑے متوازن لہجے میں کہا کہ جنگ کی حالت میں سنسر شپ ایک فطری عمل ہے۔ یہ اخبار ریگن کے خیالات کی ترجمانی کرتا تھا اس لیے اس کا احتساب ضروری تھا لیکن یہ اطلاع غلط ہے کہ اس کی اشاعت پر پابندی ہے۔ یہ اب بھی شائع ہورہا ہے لیکن نکاراگوا کے صرف ۱۲ فی صد لوگ ہی اسے پڑھتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اخبارات کے تئیں ریگن کا جو رویہ ہے اسے دیکھتے ہوئے 'لاکنسا' کی سنسر شپ بہت نرم ہے۔

بات چیت کے بعد ارنستو کارڈینال نے یوگوسلاویہ کے شاعر واسکو پوپا کی نظموں کے ہندی ترجموں کے مجموعے ''ننھی ڈبیا'' کے اجرا کی رسم بھی ادا کی۔

اجلاس کے خاتمے پر سامعین نے اس بزرگ اور مہربان شاعر کو خراجِ تحسین پیش

کرنے کے لیے اسکے گرد حلقہ سا بنا لیا اور اسی حلقے میں لیے ہوئے وہ اسے 'انٹرنگ' سے باہر لے آئے۔

لنچ کا یہ وقفہ گزارنے کے لیے میں نے کینٹین کا رخ کیا اور اپنے مشاہد دوستوں سے ساتھ بیٹھ کر گفتگو کرنے لگا۔ میرے ساتھ گجراتی کے تین ادیب گریش دمنیا، راجندر شکلا، اور پنکج شاہ بیٹھے ہوئے تھے۔ پچاس سالہ گریش دمنیا ادب کے انتہائی ذہین اور سنجیدہ قاری ہیں۔ وہ ادبیات عالم پر بڑی روانی سے بول رہے تھے۔ میں اُن کے مطالعے کی وسعت اور اردو ادب سے اُن کی واقفیت پر حیران تھا۔ کبھی وہ منیر نیازی، مجید امجد، ظفر اقبال اور زیب غوری کی شاعری پر گفتگو کرتے کبھی میر انیس کے مرثیوں کا ذکر چھیڑ دیتے اور کبھی نیر مسعود کی افسانوی نثر کی جھوم جھوم کر تعریف کرتے۔ راجندر شکلا نے مجھے گجراتی زبان میں غزلیں سنائیں اور پنکج شاہ نے اردو کے جدید تر شعرا کے منتخب اشعار۔ ہماری میز پر ایک دو مشاہد اور بھی آ گئے تھے۔ اس گفتگو کا سلسلہ اتنا دراز ہوا کہ دوسرے اجلاس کا وقت قریب آ گیا۔

سیزار لوپیز
کیوبا: ہسپانوی

سہ پہر کے اس اجلاس کے پہلے شاعر تھے کیوبا کے سیزار لوپیز (Cezar lopez) سائنس داں، سفارت کار اور اسٹیج ڈرامہ کے نقاد سیزار لوپیز نے سامعین کو اپنی آٹھ نظمیں سنائیں۔

ان میں سے پہلی چار نظموں کا تعلق اُن سلسلہ وار منظومات سے تھا جو لو پیز نے ''پردیس کے سفر کے چند اندراجات'' کے عنوان کے ماتحت اپنی مختلف مہمات کے دوران تخلیق کی ہیں۔ ان نظموں میں بڑے شہروں کی زندگی کے مختلف رخوں کو پیش کیا گیا تھا۔ لو پیز نے اس بات پر بھی گہرا طنز کیا کہ سیاسی رہنماؤں کو تخلیقی فنکاروں سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ دوسری چار نظموں کا تعلق بھی 'سٹیزنس فرسٹ بک' 'Ctizens' first book' اور 'سٹیزنس سکنڈ بک' Citizens' Second Book کے ماتحت کہی جانے والی نظموں کے اس طویل سلسلے سے تھا جو ہنوز جاری ہے۔

سیزار لو پیز کی قریب قریب ہر نظم میں ہجرت، یادِ وطن اور دربدری کا احساس موجود تھا۔ ''گھر واپسی پر'' اور ''شہر تم میں گردش کرتا رہے گا جہاں بھی تم جاؤ گے۔'' وغیر نظموں میں یہ احساس اور بھی شدید ہو گیا تھا۔

لو پیز کا کلام بڑی بے دلی سے سنا گیا۔ اُن کی نظم خوانی کے وقت بیشتر سامعین ہال سے باہر چلے گئے تھے اور جب سوالوں کا وقت آیا تو کوئی پہل کرنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ مجبوراً اشوک باجپئی کو سامعین سے سوالات کرنے کی درخواست کرنا پڑی۔ آخر ایک سامع نے سکوت توڑتے ہوئے پوچھا کہ آپ کی نظموں کا شہر کون سا شہر ہے؟ جواب میں لو پیز نے کہا کہ یہ شہر سانتیا گو کے قریب ہے۔ اسی شہر میں میری پرورش و پرداخت ہوئی اور یہیں میں نے طویل عرصہ گزارا ہے۔

اب دوسرے سامعین بھی سوال کرنے لگے۔ ان سوالوں کے جواب میں لو پیز نے کہا کہ بے شک میری نظموں پر کیوبا کے انقلاب کا بہت گہرا اثر ہے لیکن خود میری نظموں نے بھی کیوبا کے انقلاب میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سیزار نے اپنے تخلیقی مشاغل کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنی طویل نظموں کا ایک مجموعہ ''پیروڈی اینڈ اپ سائڈ ڈاؤن'' کے نام سے جلد ہی شائع کرنے والا ہوں اور اسی کے ساتھ مختصر نظموں کا بھی ایک مجموعہ شائع کروں گا۔ ایک سوال کے جواب میں لو پیز نے کہا کہ میں نے اپنے مجموعے 'سیٹز یزنس فرسٹ بک' کے آخر میں لکھا ہے کہ سچا انقلاب شروع ہو چکا ہے اس لیے میں راہِ تخلیق میں قیام کرتا ہوں۔ لیکن یہ قیام عارضی

معنی میں تھا۔ اسی لیے ’سیڑ یزنس سکنڈ بک‘ میں قیام کا یہ وقفہ ختم ہوگیا اور میں پھر اپنے تخلیقی سفر پر چل پڑا۔

لوپیز کی نظموں کا انگریزی ترجمہ پر بودھ پارٹمین نے اور ہندی ترجمہ پریاگ شکل نے پڑھ کر سنایا۔

ایپّا پانیکر
ہندستان : ملیالم

کیوبا کے شاعر کی بے لطف شعر خوانی کے دوران ’انترنگ‘ کی فضا بے جان سی معلوم ہو رہی تھی۔ اس میں زندگی پیدا کی ملیالم کے شاعر ایپّا نیکر (Ayappa Panikar) نے۔ پانیکر اپنے روایتی لباس کرتے اور دھوتی میں ملبوس مائک پر آئے اور آغاز کلام میں ایک مختصر سی دعائیہ نظم کو لے اور سُر کے ساتھ گا کر اس طرح پڑھا کہ معنی اور موسیقی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو گئے۔

اٹھاون سالہ پانیکر کیرل یونیورسٹی میں آرٹس فیکلٹی کے ڈین ہیں اور سہ ماہی ’کیرل کویتا‘ کے مدیر بھی ہیں۔ پانیکر کو کئی قومی اور بین الاقوامی اعزازات بھی مل چکے ہیں۔ ایپّا پانیکر کی نظموں میں ہندو اور مسیحی اساطیر و علامات کا استعمال بڑی فنکاری سے کیا گیا تھا۔ ملیالم کے

شاعر نے ان اساطیر و علامات کے ذریعے موجودہ عہد کے موضوعات و مسائل کی خوبصورت عکاسی کی تھی۔

مسیحی تلمیحوں پر مشتمل تین نظموں میں سے پہلی نظم Pilate میں پانیکر نے اس بات پر گہرا طنز کیا تھا کہ لوگ حضرتِ عیسیٰ کی قربانی کے اصل مقصد کو فراموش کر بیٹھے ہیں اور روزِ قربانی کو انھوں نے جشنِ مسرّت میں تبدیل کر دیا ہے۔ دوسری نظم 'اُف مسیح' میں اِسی قربانی کے مقصد و ماہیت کو موضوع بنا کر انسانی اقدار کی پامالی کا نوحہ سنایا گیا تھا:

تم سمجھتے ہو
ہم نے اپنی شقاوت کی بنا پر
تمھیں مصلوب کیا
ہمیشہ کی طرح تمھارا خیال غلط ہے
یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں
کہ تم ہماری بات سننے پر مجبور ہو
تم نے کبھی یہ بھی سوچا ہے
کہ اگر ہم تمھیں مصلوب نہ کر دیتے
تو تمھارا کیا حشر ہوتا؟

تیسری نظم ''ہم سب مریم ہیں'' میں ان عام انسانوں کا ذکر کیا گیا تھا جو اپنی زندگی میں روز اذیتیں اُٹھاتے ہیں اور جن کا مسیحا کوئی نہیں ہے۔

اپنی ایک اور نظم ''تین آوازیں'' میں پانیکر نے تین کرداروں کے ذریعے فلسفۂ نجات کی تشریح اس طرح کی تھی:

رام : ۔۔پہلی آواز : نجات موت ہے
سیتا : ۔۔دوسری آواز : ایک کی نجات بہتوں کی موت ہے
ھنومان : ۔۔تیسری آواز : نجات جہل کی موت ہے

پانیکر کی نظم خوانی اور سامعین سے ان کے مختصر مکالمے کے بعد پانچویں روز کے

آخری اجلاس کا اختتام مالویکا سرکلئی کے بھرت ناٹیم پر ہوا۔ سرکلئی نے موسیقی کے سروں کے ساتھ اپنے رقص کو اس طرح ہم آہنگ کیا کہ سامعین فن پر اُن کی قدرت کے قائل ہو گئے اور مہمان شعرا ان کے لیے سراپا تحسین بن گئے۔

سرکلئی کے رقص کی داد دیتے ہوئے جب ہم 'انترنگ' سے باہر نکلے تو ستارے آسمان پر نکل چکے تھے۔ آج اظہر راہی صاحب سے یہ طے ہوا تھا کہ شام کے اجلاس کے بعد فدا عباس صاحب کے گھر چلا جائے گا۔ سو میں ان کے اسکوٹر پر بیٹھ کر فدا عباس صاحب کے گھر کی طرف چل دیا۔ فدا عباس بھوپال یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر ہیں اور لکھنؤ کے رہنے والے ہیں۔ اُن کے گھر پہنچ کر ہم کافی دیر تک ادھر اُدھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ کبھی عالمی میلے پر، کبھی دانش گاہوں میں اردو اور فارسی کی صورتِ حال پر اور کبھی لکھنؤ کی بعض شخصیتوں پر۔ یہاں سے اٹھ کر تیز سردی میں طویل فاصلہ طے کر کے میں راہی صاحب کے ساتھ اُن کے گھر پہنچا جہاں انھوں نے میرے لیے رات کے کھانے کا اہتمام کیا تھا۔ اظہر راہی کے گھر کے بالکل سامنے تاج المساجد کا عقبی حصہ ہے۔ بیچ میں ایک تالاب ہے جو کبھی مسجد کے حوض کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اظہر راہی کے ساتھ خوش ذائقہ کھانا کھانے اور ان کی بیگم سے متعارف ہونے کے بعد جب میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ راہی صاحب اسی تیز سردی میں مجھے ہوٹل تک چھوڑنے کے لیے آئے۔

ہوٹل میں مشاہدین اپنے اپنے کمروں میں روشنیاں کیے ہوئے جاگ رہے تھے۔ بعض کمروں میں شعروادب پر گرما گرم بحثیں ہو رہی تھیں۔ میں بھی کپڑے تبدیل کر کے ایسے ہی ایک کمرے میں داخل ہو گیا اور رات کے پچھلے پہر تک ان بحثوں میں شریک رہا۔ پھر اپنے بستر پر آ کر دراز ہو گیا۔

چھٹی صبح: ۱۶ر جنوری

دفتر کشائے صبح نے الٹی نقابِ شب

گذشتہ پانچ صبحوں کی طرح یہ صبح بھی رفتہ رفتہ منوّر ہوتی ہوئی میری آنکھوں میں اترتی جا رہی تھی۔ طلوع ہوتے ہوئے آفتاب نے میرے کمرے کی دیواروں کو روشن کر دیا تھا۔ اس

روشنی کو آمدِ صبح کی دلیل سمجھ کر میں اپنے بستر سے اُٹھ گیا۔ ہوٹل کی راہداریوں میں دوڑتے بھاگتے ہوئے مشاہدوں کی آوازیں یہ بتارہی تھیں کہ سب اپنی اپنی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ انھیں تیاریوں میں میں بھی مصروف ہوگیا اور میلے کے چھٹے روز ٹھیک وقت پر بھارت بھون پہنچ گیا۔ کچھ دیر اس کے احاطے میں کھڑے ہوکر یہاں کے ماحول کا جائزہ لیا پھر 'انترنگ' میں داخل ہوکر صبح کے اجلاس کے پہلے شاعر کی نظم خوانی کا انتظار کرنے لگا۔ آج پھر پورے اسٹیج کی آرائش بدلی ہوئی تھی۔ ایک بڑے لال پردے پر تین پرتوں والا سفید پردہ لگا دیا گیا تھا۔ شعرا ہال میں داخل ہونے لگے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں 'کوی وندنا' شروع ہوئی (صبح کے اجلاس کا آغاز ہر روز اسی کوی وندنا سے ہوتا تھا۔) وندنا ختم ہوتے ہی اس اجلاس کے پہلے شاعر سے مائک پر آنے کی درخواست کی گئی اور مائک پر آئے سویڈن کے ٹومس ٹرانسٹرومر (Tomas Transtromer)

ٹومس ٹرانسٹرومر
سویڈن: سویڈش

ٹرانسٹرومر پیشے سے ماہر نفسیات ہیں اور سویڈن کے نمائندہ شاعر ہیں۔ اب تک ان کے نو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ٹرانسٹرومر کا پہلا مجموعہ ''سترہ نظمیں'' کے عنوان سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۸۱ء میں انھیں پٹرارک انعام (Petrarch Prize) اور ۱۹۸۳ء

میں شاعری کا بونیر انعام (Bonnier Poetr yPrize) مل چکا ہے۔

ٹوماس ٹرانسٹرومر نے اپنی نظم خوانی کا آغاز ۱۹۶۰ء میں کہی ہوئی دو نظموں: ''ادھوری جنت'' اور'' جاڑے کی رات'' سے کیا۔ ٹرانسٹرومر کی نظموں میں وقت کی سفاکیوں، تنہائی کی اذیتوں اور ذات کی نیرنگیوں کو موضوع بنایا گیا تھا۔ زبان و اسلوب کی سطح پر یہ نظمیں موسیقی اور مصوری کا مرکب معلوم ہوتی تھیں۔ کبھی نظم کے پیکروں سے کوئی خوش نما تصویر بنتی ہوئی نظر آتی اور کبھی زبان کے صوتی آہنگ سے غنائی تاثر پیدا ہوتا۔ ٹرانسٹرومر کے مترجم رابن فلٹن نے بھی اپنے ترجموں میں ان خصوصیات کو بڑی حد تک اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی تھی۔ سوئیڈن کے شاعر نے کئی نثری نظمیں بھی سنائیں۔ ان میں دو نظمیں: ''عورت حالتِ ناگفتنی میں'' اور'' بھولا ہوا باب''۔ سترہویں صدی کے ڈچ مصور ورمیر کی تصویروں سے متاثر ہو کر کہی گئی تھیں۔ ان نظموں میں وہ شعریت اور آہنگ موجود تھا جو نثری نظم کو شاعری کے حدود میں داخل کر دیتا ہے۔

سوال و جواب کے وقفے میں ٹرانسٹرومر نے کہا کہ میری نثری نظمیں بھی دراصل نظمیں ہی ہیں۔ جب راقم الحروف نے ان سے پوچھا کہ شعری نثر اور نثری شاعری میں کیا فرق ہے تو انھوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ وہی فرق جو ٹہلنے اور دوڑنے میں ہے۔ سچ کی ماہیت کو بیان کرتے ہوئے ٹرانسٹرومر نے کہا کہ لوگ زیادہ تر یا تو اپنی اندرونی دنیا میں رہتے ہیں یا باہری دنیا میں لیکن سچ ہمیں داخلی اور بیرونی دنیاؤں کے درمیان ایک باریک سی لکیر پر نظر آتا ہے۔ صداقتِ واقعی کا ادراک اور اس کا تجربہ ہمیں صرف اسی وقت ہوتا ہے جب یہ دونوں دنیائیں ایک دوسرے کے ساتھ بڑی شدت کے ساتھ ملتی ہیں۔ انھوں نے بیک وقت اپنی تین حیثیتوں (ماہر نفسیات، مشاق پیانو نواز اور شاعر) کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں بنیادی طور پر شاعر ہی ہوں۔ بقیہ دونوں حیثیتیں میں نے اسی شاعرانہ طبیعت کی بنا پر حاصل کی ہیں۔ ایک سامع کی اس صلاح پر کہ ترجمے کی دقتوں سے بچنے کے لیے آپ اپنی نظمیں انگریزی میں کیوں نہیں لکھتے، ٹرانسٹرومر نے کہا کہ میں نثر تو انگریزی میں لکھ سکتا ہوں لیکن شاعری اپنی مادری زبان ہی میں کی جانا چاہیے۔ انھوں نے مثال میں اپنی ایک نظم میں مستعمل

ایک لفظ (جس کا ترجمہ ہے حدودِ صداقت سے نکل جانا) کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ سوئیڈش زبان کا ایک پیچیدہ لفظ ہے اور اس کے معنوی تاثر کو ترجمے میں منتقل نہیں کیا جا سکتا۔

ٹرانسٹرومر کے انگریزی ترجمے اشوک باجپئی نے پڑھے اور ہندی ترجمے رمیش چندر شاہ نے۔

ہومیر و ایرِ یجس
میکسکو: ہسپانوی

اسی اجلاس کے دوسرے شاعر تھے میکسکو کے ہومیر و ایرِ یجس (Homero Aridjis) ایرِ یجس مختلف ملکوں میں میکسکو کے سفیر رہے ہیں اور اب ہالینڈ میں یہی عہدہ سنبھالنے جا رہے ہیں۔ انھوں نے اپنی دس نظمیں سنائیں۔ ان نظموں میں اساطیر سے اخذ کی ہوئی علامتوں کے ذریعے ماضیِ بعید کے واقعات میں عصری معنویت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایرِ یجس کی نظموں میں تجربوں کی وسیع دنیا موجود تھی۔ یادِ وطن، انسان سے محبت اور وجود کی تفہیم و تعبیر ان کے مستقل موضوعات تھے۔

سامعین سے گفتگو کرتے ہوئے ایرِ یجس نے کہا کہ قدامت اور روایت سے ہمارا گہرا رشتہ ہے اور ہمارے ملک میں ماضی ہمیشہ حال سے ہم آہنگ رہتا ہے۔ ایرِ یجس نے کہا کہ میرا بچپن پہاڑی علاقوں میں گزرا ہے جہاں سورج ہی عبادت اور ریاضت کا واحد ذریعہ ہے۔

اسی لیے سورج کا ذکر میری نظموں میں بار بار ہوا ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ میکسکو میں شاعری کے قارئین کی کیا صورت حال ہے تو انھوں نے کہا کہ میرے یہاں شاعری کے عالمی میلوں کے ہر اجلاس میں پانچ ہزار کی تعداد میں سامعین جمع ہوتے ہیں۔

اسی اجلاس میں ٹومس ٹرانسٹرومر نے بھارت بھون کے دوماہی پرچے ''پوروگرہ'' کی رسم اجرا بھی ادا کی۔ اس پرچے میں مدعوشعرا کی نثری تحریریں شامل ہیں۔

اجلاس کے خاتمے کے بعد ہم میں سے کچھ مشاہدین ہوٹل چلے گئے اور کچھ نے کینٹین ہی میں بیٹھنا پسند کیا۔ میں نے بھی کینٹین ہی میں بیٹھنے کو ترجیح دی۔ یہاں اس وقت مشاہدین کی گفتگو کا موضوع تھے چلی کے صفِ اوّل کے شاعر نکانور پارا۔ پارا کی نظم خوانی کا انتظار بھی اس میلے کے پہلے ہی دن سے کیا جا رہا تھا۔
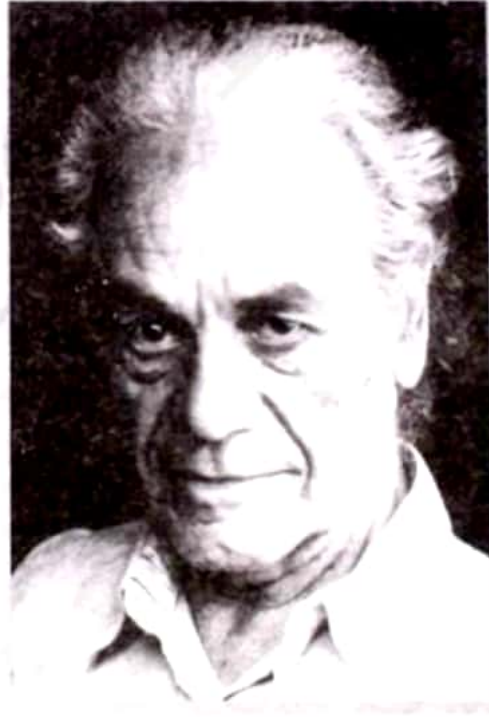
نکانور پارا
چلی: ہسپانوی

نکانور پارا اس وقت دنیا کی سب سے اہم اور پراثر آوازوں میں سے ایک ہیں۔ وہ ۱۹۱۴ء میں چلی میں پیدا ہوئے۔ آکسفورڈ اور براؤن یونیورسٹی سے گریجویشن کی تعلیم حاصل

کرنے کے بعد انھوں نے کچھ عرصے تک چلی یونیورسٹی میں فطری طبیعیات کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا۔ پھر میکینکس کے مبادیات کی تعلیم حاصل کی اور پرِنسپیا میتھیمیٹکا کا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے نیوٹن کے مقابلے میں سترہویں صدی کے ماہر طبیعیات کرسٹیان ہوئجنس (Christiaan Huygens) کو زیادہ اہم اور معتبر جانا جس کے تحقیقات نے آئن اسٹائن کے نظریات کو جنم دیا۔

سولہ شعری مجموعوں کے خالق نکانور پارا کو ۱۹۶۹ء میں چلی کا سب سے بڑا اعزاز بھی مل چکا ہے۔ ہماری بات چیت میں بنگالی کے نوجوان ادیب سبودھ سرکار پارا کے لیے سراپا تحسین بنے ہوئے تھے۔ کھانے کے ساتھ ساتھ ادب اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر ہونے والی یہ گفتگو بالآخر اس وقت ختم ہوئی جب سہ پہر کے اجلاس کا وقت قریب آ گیا۔ ہم سب اُٹھ کر جلسہ گاہ کی طرف بڑھنے لگے اور 'انتر نگ' میں داخل ہو کر چلی کے بزرگ اور محترم شاعر کے مائک پر آنے کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد چوڑے سینے، کشادہ پیشانی اور گھنگھریالے بالوں والا ایک شخص ایک سادہ سی مٹ میلی قمیض پہنے آہستگی سے چلتا ہوا مائک پر آیا۔ پھر ہال میں بیٹھے ہوئے سامعین کا جائزہ لیا، مہمان شاعروں پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی، منتخب نظموں کو اپنے سامنے رکھا اور اسٹینڈ پر اپنی دونوں کہنیاں ٹکا کر ان نظموں کو پڑھنا شروع کیا: ''تنبیہہ''، ''رسوم''، ''ایک معمولی بورژوا کا کرب''، ''متن''، ''تاثرات''، ''تجاویز''، ''امریکہ جہاں آزادی کا مجسّمہ ہے''، ''شخص جس کا میں نے تصور کیا'' وغیرہ نظموں نے اپنے موضوعات کی ندرت کی بنا پر سامعین کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ پارا نے ان نظموں میں کسی طرح کی صناعی یا شعری حرفت سے کام نہیں لیا تھا۔ ان کا اسلوب بالکل سادہ اور شعریت سے عاری معلوم ہوتا تھا۔ پارا یوں بھی شاعری میں مرصع کاری اور اسلوب سازی کے مخالف ہیں اسی لیے وہ دنیا میں اینٹی پوئٹری کے علم بردار شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ژاں ڈروزیلٹ نے پارا کے بارے میں کہا تھا کہ پارا نے شاعری کی دنیا میں شعری اظہار کا ایک ایسا لہجہ ایجاد کیا ہے جو پابلو نرودا، ڈی روکھاس بلکہ ونسنٹ ہیوڈوبرس Vincente Hudobers سے کہیں زیادہ انقلابی اور جرأت مندانہ ہے۔

پارا کی اینٹی پوئٹری کے اس نمایاں لہجے کی قوت کا اثر یہ ہوا کہ لاطینی امریکہ کے ہر ادبی نقاد کو یا تو اس لہجے کی مخالفت کرنا پڑی یا اس کا دفاع کرنا پڑا۔

نکانور پارا کی نظموں میں اس انسان کی تصویر کشی کی گئی تھی جو مزاحم قوتوں سے اوّل اوّل بڑی جرأت اور جوانمردی سے برسرِ پیکار ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ کمزور پڑنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ان طاقتوں سے مفاہمت کر لیتا ہے۔ پارا نے اپنے طنزیہ لب و لہجے میں اُن نام نہاد انسانی اقدار کا کھل کر مذاق اڑایا تھا جن کے نام پر ہم ایک بہتر انسان اور ایک مثالی دنیا کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں۔ شعریت سے عاری کھرے اور سپاٹ اسلوب والی ان نظموں میں سے ایک نظم ''تجاویز'' کو سامعین نے بہت پسند کیا:

میں اداس ہوں کہ کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے
دنیا تو سوچتی ہی نہیں
کہ یہاں کوئی بھکاری نہیں ہونا چاہیے
جو کہ میں برسوں سے کہتا آرہا ہوں
میری تجویز ہے کہ ہم گلستانوں میں
تتلیوں کے بجائے کیکڑے رکھا کریں
یہی بہتر رہے گا
کیا آپ فقیروں کے بغیر کسی دنیا کا تصور کر سکتے ہیں؟
میری تجویز ہے کہ ہم سب کیتھولک ہو جائیں
یا پھر کمیونسٹ یا جو بھی کہیے
یہ تو ایک لفظ کی جگہ دوسرے لفظ کو رکھ دینے کی بات ہے
میری تجویز ہے کہ ہم پانی کو مصفّٰی کریں
میں اس اختیار سے کام لیتے ہوئے جو اس بھکاری دنیا نے مجھے دیا ہے
یہ تجویز کرتا ہوں کہ پوپ مونچھیں رکھ لے

مجھے بھوک نے توڑ دیا ہے
میری تجویز ہے کہ کوئی مجھے ایک سینڈوچ دے دے
اور پھر یکسانی کو دور کرنے کے لیے
میں تجویز کرتا ہوں کہ سورج پچھّم سے نکلا کرے

شاعری میں کم سے کم لفظوں کا استعمال کرنے والے پارا نے اپنی کئی مختصر نظموں میں سے ایک نظم ''امریکہ جہاں آزادی کا مجسمہ ہے'' میں امریکہ کی آزادی پر یہ کہہ کر طنز کیا کہ آزادی وہاں ایک بے جان مجسمے کے اندر مقید ہے۔

اپنی اینٹی پوئٹری اور 'ایمر جنسی نظموں' کی بنا پر دنیا بھر میں شہرت حاصل کرنے والے چلی کے اس ۷۴ سالہ شاعر نے سامعین سے دل چسپ گفتگو کرتے ہوئے اپنی شاعری کے بارے میں کہا: ''میں نظم بھی لکھتا ہوں اور اینٹی نظم بھی۔ لیکن اینٹی نظم بھی نظم ہی ہے''۔ انھوں نے مہاتما گاندھی کے اس قول سے مکمل اتفاق کرتے ہوئے کہ شاعری انسان کو نظریے کی غلامی سے آزاد کرتی ہے، کہا کہ شاعری میرے لیے کھوئی ہوئی شناخت کو دوبارہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اس کھوئی ہوئی شناخت کی بازیافت لفظوں کے لیے نسخۂ کیمیا ہی سے ممکن ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس شناخت کو حاصل کرنے کی سب سے پہلی مثال بودلیر کی ہے۔ پارا نے اس موقع پر صلیب بردوش سینٹ جان کا بھی حوالہ دیا جنھوں نے انسان کی تلافی کے لیے حمد و مناجات پڑھنے کی تلقین کی تھی۔

شاعری اور نظری طبعیات کے میدان میں ایک ہی مقام و مرتبہ کے حامل نکانور پارا نے طبعیات اور اینٹی پوئٹری کی زبان کو یکساں قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہ دونوں ادائے مطلب کے لیے ریاضی کا استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اینٹی پوئٹری کسی غیر ضروری لفظ سے اُسی طرح اپنا دامن بچاتی ہے جس طرح طبعیات کسی (فضول) ذرّے سے۔ داخلی اور خارجی حقیقتوں کی تشریح سے متعلق ایک سوال کے جواب میں پارا نے کہا کہ وہ کسی قسم کے فلسفے کے چکرّ میں پڑے بغیر شاعری کرتے ہیں اس لیے اس طرح کی وضاحتوں میں انھیں کوئی دل چسپی نہیں۔

چلی کے اس بلند مرتبہ شاعر کی نظموں اور اس کی مختصر گفتگو سے محظوظ ہونے کے بعد

چائے کے لیے ہم پھر چبوتروں پر آ گئے جہاں پارا اپنے پرستاروں میں گھرے ہوئے اجلاس میں اپنی کامیابی سے بے نیاز چائے کی چسکیوں کے ساتھ ہنس ہنس کر گفتگو کر رہے تھے اور اُن سوالوں کے جواب بھی دے رہے تھے جو اجتماعی مکالمے کے دوران کسی وجہ سے نہیں پوچھے جا سکے تھے۔

رگھوویر سہائے
ہندستان: ہندی

اس اجلاس کے دوسرے اور آخری مرحلے میں ہندی کے معروف شاعر رگھوویر سہائے نے اپنی نظم خوانی کا آغاز ایک پرانی نظم ''دیا شنکر'' سے کیا۔ انھوں نے اپنی بارہ نظمیں سنائیں جن میں ''کینسر''، ''درد''، ''الارم''، ''یہ چہرہ'' اور ''جنگ بندی'' وغیرہ کو سامعین نے بہت پسند کیا اور ان نظموں پر اُنھیں کھل کر داد ملی۔ ان کی نظم ''یہ چہرہ'' میں اس انسان کو موضوع بنایا گیا تھا جو فنا ہوتی ہوئی تہذیب میں اپنی انفرادیت کو قائم رکھنے کی جنگ لڑ رہا ہے۔

رگھوویر سہائے ہندی کے موقر جریدے 'دِن مان' کے ایڈیٹر بھی رہ چکے ہیں اور انھیں ساہتیہ اکاڈمی کے انعام سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ ان کی نظموں کے انگریزی ترجمے اپیا پانیکر اور اشوک باجپئی نے پڑھے۔

مکالمے کے مختصر وقفے میں یہ پوچھے جانے پر کہ مشہور اسٹیج اداکار صفدر ہاشمی کے قتل کے بعد ادیبوں کو کیا کرنا چاہیے، انھوں نے کہا کہ وہ تخلیقی سرگرمیاں جاری رکھیں کیونکہ لکھتے رہنے ہی سے جنگ جاری رہے گی۔ ایک سامع کے اس سوال پر کہ آپ کا شعری اسلوب روایتی اسلوب سے مستعار ہے یا خود آپ کا وضع کردہ ہے، انھوں نے کہا کہ جہاں تک اسلوب کا سوال ہے میں کوئی نہ کوئی روایت بناتا یا توڑتا رہتا ہوں۔

رگھوویر سہائے کی نظم خوانی کے بعد نکاراگوا کے بزرگ شاعر ارنستو کاردینال نے ایشیائی شاعری کے مرکز کا افتتاح کیا۔ اسکے ساتھ ہی انھوں نے 'پوروگرہ' کے ایشائی شاعری سے متعلق دوسرے خاص نمبر کی رسمِ اجرا بھی ادا کی۔

شاعری کے مرکز کا افتتاح کرتے ہوئے ارنستو کاردینال نے کہا کہ فن کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ اب بھارت بھون ایشیائی شاعری کا بھی اہم مرکز بننے جارہا ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ یہ مرکز شعرا اور شعریات کے نئے آفاق کی جستجو کے ذریعے ایشیا کے شعرا کو ایک دوسرے سے قریب لانے میں اہم کردار ادا کرے گا۔

اجلاس کے خاتمے کے بعد میں 'انتر نگ' سے باہر نکلا تو فن کے اس گہوارے پر سیاہی گہری ہونے لگی تھی۔ میں تیز روشنیوں میں مدعو شعرا کی نظموں کے انگریزی ترجموں کے مجموعے ''واگرتھ'' کی ورق گردانی کرتا ہوا پارا کے نام والا صفحہ تلاش کر رہا تھا اور جیسے ہی یہ صفحہ نظر آیا میں نے اسے پارا کی طرف بڑھا دیا۔ پارا نے مسکراتے ہوئے اس صفحہ پر ایک کارٹون بنا کر اپنے دستخط کر دیے۔ پھر ہم لوگ پارا کو حلقے میں لیے ہوئے بھارت بھون کے صدر دروازے تک آئے اور روز کی طرح اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہوٹل پہنچ کر اٹلی سے آئی ہوئی مشاہد میری آرچر نے مجھ سے کہا کہ وہ ہندستان کی موجودہ اردو شاعری پر مجھ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہیں۔ اپنی رپورٹوں کو مرتب کرنے کی غرض سے آرچر چونکہ رات میں دیر تک جاگنا چاہتی تھیں اس لیے انھوں نے کھانا ملتوی کر دیا اور ہم نے چائے کے گھونٹوں کے ساتھ یہ گفتگو شروع کر دی۔ آرچر موجودہ اردو شعرا کے بارے میں طرح طرح کے سوال کرتی رہیں اور میں ان کے جواب دیتا رہا۔ ہندستانی شاعری بالخصوص

اردو شاعری پر ہر پہلو سے گفتگو کرنے کے بعد جب سکوت کی ایک طویل ساعت درمیان میں آئی تو میں نے آرچر سے ہندستانی انگریزی سے متعلق اسپنڈر کے اس متنازعہ فقرے کا ذکر چھیڑ دیا جو بھارت بھون میں ہنوز گفتگو کا موضوع بنا ہوا تھا۔ آرچر نے سخت لہجے میں کہا کہ ہندستانی انگریزی کو انگلستان جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اُس نے ہندستان میں اپنی فضا خود تیار کر لی ہے۔ انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ انگریزی یہاں کی باقاعدہ زبان بن چکی ہے اور اسے یہاں سے کبھی بھی نکالا نہیں جا سکتا۔ اس گفتگو میں جب رات زیادہ گزرنے لگی تو ہم نے یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ ہوٹل میں اس وقت بہت سے مشاہدین اپنے کمروں میں موجود نہیں تھے۔ کل اس میلے کا آخری دن تھا اس لیے یہ مشاہدین بیرونی شعرا سے تفصیلی گفتگو کرنے کے لیے ان کے ہوٹل' فلک نما' چلے گئے تھے۔ آرچر کو رخصت کرنے کے بعد میں بستر پر دراز ہو کر اس میلے کے آخری دن کا انتظار کرتے کرتے سو گیا۔

آخری صبح: ۱۷ر جنوری

آئی بہار میں گلِ مہتاب پر خزاں

میلے کے آخری دن کی صبح طلوع ہوئی تو ہم سب افسردہ و مغموم تھے۔ اس شہر میں یہ ہماری آخری صبح تھی۔ کل کا سورج نمودار ہونے سے پہلے ہم میں سے بیشتر کو اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف لوٹ جانا تھا۔ اور ہم یہی سوچ کر رنجیدہ ہو رہے تھے۔ یہ مہکتی ہوئی صبحیں' چمکتی ہوئی دوپہریں، جھلملاتی ہوئی شامیں، بولتی ہوئی راتیں، یہ ہنستے ہوئے چہرے، سوچتی ہوئی آنکھیں، یہ خوش کلامیاں اور حاضر جوابیاں۔ کل روز و شب کے آئینوں سے یہ سارے عکس محو ہو جائیں گے۔ معدوم ہوتی ہوئی ان خوشگوار ساعتوں کا دکھ دلوں میں لیے ہوئے ہم ہوٹل کے احاطے میں کھڑی ہوئی بس پر سوار ہو گئے اور کچھ ہی دیر میں بھارت بھون پہنچ گئے۔ سامعین رفتہ رفتہ ہال میں داخل ہو رہے تھے۔ کچھ لوگ ہال کے باہر والے اسٹینڈ پر لگے ہوئے خبروں کے تراشوں کو پڑھ رہے تھے اور کچھ لوگ اسی اسٹینڈ پر لگے ہوئے آخری روز کے پروگرام کو بغور دیکھ رہے تھے۔

علیم کیشوخوف

روس: روسی

بھارت بھون کے منتظمین گوری رنگت اور گول چہرے والے ایک شخص کو حلقے میں لیے ہوئے 'واگرتھ' کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ روسی شاعر علیم کیشوخوف ہیں جو مشہور روسی شاعرہ بیلا اخمادیلونا کی جگہ پر تشریف لائے ہیں۔ اخمادی لونا خرابِ صحت کی بنا پر اس میلے میں نہیں آسکی تھیں۔ علیم کیشوخوف کے ساتھ ہم بھی ہال میں داخل ہوئے جو قریب قریب سامعین سے بھر چکا تھا۔ آج اس ہال کی آرائش واقعی قابلِ دید تھی۔ سیاہ پردے کی زمین پر سرخ اور زرد رنگ کی ڈوریوں سے لہردار جھالریں تان کر اُن میں جگہ جگہ پھول پتیاں لگادی گئی تھیں۔ دور سے یہ کوئی منڈپ معلوم ہوتا تھا۔ ان جھالروں پر پڑتی ہوئی لال رنگ کی روشنی نے ان کے حسن میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ مدعو شعرا اور مشاہدین کی نشستیں بھی پھول پتیوں سے بجی ہوئی تھیں۔ میں مشاہدین کی صف میں پہنچ چکا تھا اور اشوک باجپئی نے جلسے کی باقاعدہ کارروائی شروع کرنے کے لیے مائک سنبھال لیا تھا۔ وہ صبح کے اجلاس کے پہلے شاعر کا تعارف کراتے ہوئے انھیں نظم خوانی کی دعوت دے رہے تھے اور مائک پر تشریف لا رہے

تھے روس کی سپریم سوویت کے رکن علیم کیشوخوف جنھوں نے اپنی نظم خوانی کا آغاز بیلا اخماد ی لونا کی ایک نظم ''گونگا پن'' سے کیا اور کہا کہ وہ اخماد یلونا کا نعم البدل تو ثابت نہیں ہو سکتے تاہم وہ انکی کمی کو کسی حد تک پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

کیشوخوف نے اپنی کئی نظمیں سنائیں۔ان میں سے بیشتر نظموں میں حسن فطرت کو موضوع بنا کر زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویر کشی کی گئی تھی۔کیشوخوف پر اکتوبر انقلاب کا بھی گہرا اثر تھا۔اپنے ملک میں شاعری کے اعلیٰ ترین انعام ''گورکی ایوارڈ'' سے سرفراز کیے جانے والے علیم کیشوخوف نے اپنی نظم خوانی کا اختتام قدیم روایات ورسوم کے پس منظر میں کہی ہوئی ایک نظم ''میرا سورج'' سے کیا۔

سامعین کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے علیم کیشوخوف نے کہا کہ حال ہی میں پروسترائیکا کی وجہ سے روسی ادب زیادہ وقیع اور بہتر ہوا ہے۔انھوں نے کہا کہ ان سیاسی تبدیلیوں نے ادب پر عائد بہت سی پابندیاں ختم کردی ہیں اور اب روس میں وہ فلمیں اور ڈرامے بھی دکھائے جانے لگے ہیں جو پہلے ممنوع قرار دے دیے گئے تھے۔اس طرح ہمیں اظہار کی ایک نئی آزادی ملی ہے۔سلسلۂ بیان جاری رکھتے ہوئے علیم کیشوخوف نے کہا کہ پہلے روس میں شاعری سیاست کے تابع تھی اور شاعری کے موضوعات کا تعین بھی سیاسی مقاصد کو مدنظر رکھ کر کیا جاتا تھا لیکن اب شاعری سیاست پر اثر انداز ہورہی ہے۔جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ ان کی شاعری پر اشترا کی نظریات کا کوئی اثر نہیں ہے تو انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ ایسا غالباً ترجے کی خامیوں کی وجہ سے محسوس ہورہا ہے۔

کیشوخوف کی نظموں نے سامعین کو زیادہ متاثر نہیں کیا۔موضوع اور اسلوب کی سطح پر یہ نظمیں عالمی شاعری کے معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں اور اسی لیے چائے کے وقفے میں کیشوخوف کی نظموں پر کوئی گفتگو نہیں کی گئی۔

کارلوس مرسیانو

اسپین: ہسپانوی

صبح کے اجلاس کے دوسرے شاعر اسپین کے کارلوس مرسیانو نے اپنی خوش آہنگ اور تہہ دار نظموں سے کیشوخوف کی بے لطف شاعری کا احساس بہت جلد ختم کر دیا۔ مرسیانو شاعری میں موضوع بیان سے زیادہ اسلوب بیان کو اہمیت دیتے ہیں اور شعریت ہی کو شاعری کا بنیادی عنصر قرار دیتے ہیں۔ شاعری ناول نگاری اور ادب اطفال میں یکساں قدرت کا مظاہرہ کرنے والے کارلوس مرسیانو تقریباً ۳۰ شعری مجموعوں کے خالق ہیں اور بچوّں کے ادب کے لیے انھیں اسپین کا اعلیٰ ترین قومی انعام بھی مل چکا ہے۔ انھوں نے اپنی نو نظمیں سنائیں۔ غنائیت اور معنویت سے بھرپور ان نظموں میں اسپین کے استعارہ ساز شاعر نے دنیا سے متعلق اپنے دقیق مشاہدات بیان کیے تھے۔ انسانی جذبات و محسوسات کی متحرک تصویریں پیش کرنے والی یہ نظمیں اپنی اثر انگیزی کی بنا پر سامعین میں بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔ مرسیانو کی بہت زیادہ پسند کی جانے والی نظموں کے عنوان تھے: ''شاعری کے لیے ایک کتبہ''، ''لوٹ آنے والا''،

'بادل'' اور'' جو بتاتی ہے لیلیا ہواریز اور اس کے زرد پیانو کے بارے میں'' ''شاعر کے لیے
یک کتبہ'' مرسیانو کی سب سے پراثر نظم تھی۔ یہ ایک جواں سال ویت نامی لڑکی کی المناک
وت پر کہی گئی تھی جو ایک ایسے امریکی سپاہی کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی جسے اس لڑکی سے
یادہ ویت نام کی جنگ سے دلچسپی تھی۔

ان نظموں پر گفتگو کرتے ہوئے کارلوس مرسیانو نے کہا کہ تخیل اور تجربے کو ایک
وسرے میں ضم کردینا ہی شاعری ہے۔ یہ پوچھے جانے پر کہ انھیں بار بار اپنا گاؤں کیوں یاد
آتا ہے، انھوں نے کہا کہ میرا بچپن گاؤں ہی میں گذرا ہے اور عشق بھی یہیں پروان چڑھا
ہے۔ اسی لیے اس کی یادیں میڈرڈ میں بھی میرے ذہن سے چمٹی ہوئی ہیں جہاں تلاش معاش
کے لیے یہ گاؤں چھوڑ کر مجبوراً مجھے جانا پڑا۔ انھوں نے کہا کہ یاد میرے لیے ایک قیمتی تجربہ ہے
اور میری زندگی کا ایک اہم اور ضروری حصہ۔ جب ایک سامع نے ان کی نظموں کو ''یادِ وطن کی
بیماری'' سے تعبیر کیا تو انھوں نے کہا کہ یہ تاثر غلط ہے۔ میری نظمیں گزشتہ زمانوں کی معنی خیز باز
آفرینی ہیں۔ اسپین کی موجودہ شاعری کا ذکر کرتے ہوئے مرسیانو نے انکشاف کیا کہ اسپین
کے شعرا کو سیاسی اور سماجی موضوعات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ فرانکو کے دورِ اقتدار والی
شاعری کے برخلاف یہ شاعر زبان و بیان اور انداز و اسلوب پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

مرسیانو کے کلام کے بعد صبح کے اجلاس کا خاتمہ ہوا اور میں فضل تابش اور وقار فاطمی
وغیرہ کے ساتھ بھارت بھون کی کینٹین میں آکر بیٹھ گیا۔ گذشتہ روزوں کے برخلاف آج
سہ پہر کا اجلاس تین بجے ہی شروع ہونے والا تھا۔ (روز یہ اجلاس ۴ بجے شروع ہوتا تھا) اور شعرا
اور مشاہدین سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ وہ وقت مقررہ پر جلسہ گاہ میں پہنچ جائیں۔ چنانچہ
ادھر اُدھر کی گفتگو میں لنچ کا بہ نسبتہً مختصر وقفہ گذارنے کے بعد ہم مقررہ وقت پر اس میلے کے
آخری اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے 'انترنگ' کی طرف چل دیے۔

کوفی آونور

گھانا: انگریزی

اس اجلاس کی مرکزی شخصیت تھے کوفی آونور جو اپنے علاقائی لباس میں ملبوس خود بھی ٹھیک وقت پر بھارت بھون پہنچ گئے تھے اور اس وقت بھوپال میں قیام پذیر افریقی طلبہ کے حلقے میں کھڑے ہوئے اُن سے بڑی خوش دلی اور بے تکلفی سے گفتگو کر رہے تھے۔ یہ سیاہ فام طلبہ اس وقت کوفی آونور کو سننے کے لیے بڑی تعداد میں یہاں پر جمع تھے۔ 'انترنگ' سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ شعرا اپنی نشستیں سنبھال چکے تھے اور مشاہدین کی صفیں آراستہ ہو چکی تھیں۔ میں نے اپنی گھڑی پر نگاہ کی' تین بجنے ہی والے تھے اور جیسے ہی تین بجے، اشوک باجپئی نے ڈائس پر آ کر آج کی تقریبات کے مختلف مرحلوں کا اعلان کیا۔ ہال میں اب تِل دھرنے کی بھی جگہ نہیں تھی۔ سامعین سے چھلکتے ہوئے اس ہال میں اشوک باجپئی کی آواز ایک بار پھر بلند ہوئی۔ اس بار وہ گھانا کے مقبول و معروف شاعر کوفی آونور کو کلام پڑھنے کی دعوت دے رہے تھے۔ اور میں نے دیکھا کہ شاعروں کی صف سے اپنا بیل بوٹوں والا روایتی چغہ پہنے ہوئے کوفی آونور نمودار ہوئے اور مائک کی طرف بڑھنے لگے۔ پورا ہال تالیوں سے گونجنے لگا۔ سیاہ فام

طلبہ نے ان کا پر جوش استقبال کیا۔

مائک پر آ کر گھانا کے اس انقلابی شاعر نے اپنی پہلی نظم اُن ہزاروں افراد کے نام منسوب کی جو بھوپال المیے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ یہ دعائیہ نظم افریقہ کی خوبصورت ڈرم موسیقی کی طرز میں ترتیب دی گئی تھی۔ اس نظم نے سامعین کو جذباتی سطح پر بہت متاثر کیا۔ آ ونور نے اپنی دوسری نظم کو چلی کے عظیم شاعر پبلو نرودا کے نام معنون کیا اور ایک نظم یہ کہتے ہوئے اشوک باجپئی کی نذر کی کہ اشوک باجپئی ادب کا ایک جلیل القدر حکمراں ہے۔

توسیع پسند اور سامراجی طاقتوں کے خلاف اپنی شاعری کو ایک کارگر ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے والے اس افریقی شاعر نے اپنی ایک درجن سے زائد نظموں کے انقلابی آہنگ سے سامعین کو خوب محظوظ کیا۔ افریقہ میں جاری آزادی کی جنگ اور افریقی عوام کا دکھ درد ہی کوفی آ ونور کی نظموں کا بنیادی موضوع تھا اور آ ونور اس موضوع کو مناسب ترین شعری پیرائے میں ادا کرنے کا فن بھی جانتے تھے۔

آ ونور کی نظموں میں ''تماشائی''، ''ذاتی اندراج''، ''مرثیہ'' اور'' تلاشِ مکرر'' وغیرہ کو سامعین نے بہت پسند کیا۔ کوفی آ ونور نے ایک ایسی مختصر نظم بھی سنائی جس میں دانش گاہوں میں تحقیق کے گرتے ہوئے معیار پر زبردست طنز کیا گیا تھا اور ان نام نہاد پی۔ ایچ۔ ڈی اسکالروں کی خوب خبر لی گئی تھی جو دانشوری کی علامت ہیں۔

سوال و جواب کے مختصر وقفے میں ایک افریقی طالب علم کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کوفی آ ونور نے کہا کہ مجھے توسیع پسند طاقتوں کی مخالفت کی بنا پر کئی بار جیل جانا پڑا جہاں میں نے اپنے قیدی ساتھیوں پر طرح طرح کے مظالم ہوتے ہوئے دیکھے۔ ان مظالم نے میرے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ میری تحریروں میں ان مظالم کی بازگشت آپ کو بار بار سنائی دے گی۔

اختتامیہ

سہ پہر کے اس شعری اجلاس کے بعد آغاز ہوا اختتامی تقریب کا۔ یہ الوداعی تقریب بڑی جذباتی اور پر اثر تھی۔ مدعو شعرا نے جذبات سے مغلوب آوازوں میں اس سات روزہ میلے سے متعلق نظم ونثر میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ نکاراگوا کے ارنستو کاردینال نے اس میلے کو دنیا کا عظیم ترین شعری میلہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ یہاں پر موجود ہم تمام شاعر توسیع پسندی اور سامراجیت کے نتیجے میں رونما ہونے والے بھوپال گیس المیے پر زبردست احتجاج کرتے ہیں اور دنیا کے تمام قلم کاروں کو سرمایہ دار طاقتوں کے خلاف صف آرا ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ نائیجیریا کے شاعر گبرئیل اوکارا نے اس موقع پر بھوپال ہی میں لکھی ہوئی ایک جذباتی نظم 'رخصتی سلام'' کے عنوان سے پڑھی۔ کارلوس مرسیانو نے بھی اسی شہر میں کہی گئی ایک نظم ''باغ میں ایک چڑیا'' سنائی۔ ارجنٹائنا کے رابرتو ہواروز نے بھی ایک تاثراتی نظم کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا اور کہا کہ یہاں ہم سب نے مل کر ایک نظم تخلیق کی ہے۔ انڈونیشیا کے ڈبلو۔ ایس رینڈرا نے ۱۹۷۳ء میں لکھی ہوئی ایک نظم سنائی جو بھوپال گیس المیے پر پوری طرح منطبق ہوتی تھی۔ چیکوسلواکیہ کے میروسلاو ہولب نے بھوپال کے سامعین کے ذوق سماعت کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ بلاشبہ میری نگاہ میں یہ بہترین سامعین ہیں ہنگری کے فیرینتس یوہاش یوہاش اور ڈنمارک کے ہنرح نارڈ برانٹ نے اس میلے کو دنیا کا اہم ترین میلہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ہم اپنے ملکوں میں اسکا خصوصیت کے ساتھ ذکر کریں گے۔

سویڈن کے ٹومس ٹرانسٹرومر نے اس رنگا رنگ اور دوستانہ اجتماع کو ناقابل فراموش بتاتے ہوئے کہا کہ اس میلے نے مجھے جذباتی طور پر بہت متاثر کیا ہے۔ میکسکو کے ہومیر وایریجس نے اس اجتماع کو میکسکو اور ہندستان کے درمیان ثقافتی رشتے سے تعبیر کیا۔

چلی کے بزرگ شاعر نکانور پارا نے کہا کہ مجھے اس ملک میں آکر اور یہاں کے سامعین کو اپنی نظمیں سنا کر ایک غیر معمولی تجربہ ہوا ہے۔ جنوبی کوریا کے چانگ ہیانگ جانگ نے اپنی زبان میں ایک الوداعی نغمہ ''ہمیشہ تمھاری یاد آتی ہے'' گاکر انترنگ کی جذباتی فضا کو

اور جذباتی بنا دیا۔ چین کی نوعمر شاعرہ شوتنگ نے یہ انکشاف کرتے ہوئے کہ روم میں ایک ایسا فوارہ ہے جس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اگر اس کی طرف پیٹھ کر کے ایک سکہ اچھال کر کوئی منت مانی جائے تو وہ ضرور پوری ہوتی ہے، خود بھی بیس پیسے کا ایک سکہ سامعین کی طرف پیٹھ کر کے اچھالا اور بھوپال دوبارہ آنے کی دعا کی۔

اس تقریب میں مشاہدین کی نمائندگی کرتے ہوئے ملیالم کے نوجوان شاعر و نے چندرن نے ملیالم زبان میں ایک لوک گیت سنا کر اپنی خوش لحنی سے مہمان شعرا کو بہت محظوظ کیا۔ مشاہدین کی جانب سے شکریے کی رسم ادا کی کنڑ کے شاعر رام چندر ور مانے۔

اسی تقریب میں یہ خوش خبری بھی دی گئی کہ چلی کے ممتاز شاعر نکانور پارا نے بھارت بھون میں مہمان مصنف (Writer in Residence) کی حیثیت سے آنے کی دعوت قبول فرمالی ہے۔

اختتامی تقریب کا ایک پہلو وہ رنگارنگ ثقافتی پروگرام بھی تھا جسے بھارت بھون کے رنگ منڈل کے اداکاروں نے مختلف مرحلوں میں شہرۂ آفاق شاہکاروں کی جھلکیوں کی شکل میں پیش کیا تھا۔ اس سلسلے کی پہلی پیش کش تھی ہیودن کی ''گنیش وندنا'' جس کے ہدایت کار ہیں گریش کرناڈ۔ دوسری کڑی تھی کالی داس کا ڈرامہ ''ابھگیان شاکنتلم'' (ہدایت کار راوبوتا بیتی)۔ 'مالویکا اگنی متر' اس سلسلے کی تیسری پیش کش تھی۔ اس میں بندیل کھنڈ میں ہولی کا تہوار دکھایا گیا تھا۔ وجے تندولکر کا مشہور ڈرامہ 'گھاسی رام کوتوال' جے شنکر پرساد کا تاریخی ڈرامہ 'اسکند گپت'، مہابھارت سے متعلق دھرم ویر بھارتی کا ڈرامہ ''اندھا یگ'' (ہدایت کار بنسی کول) اور ستیش آلیکر کے 'مہانروان' (ہدایت کار الکھ نندن) کے بھی کچھ حصے پیش کیے گئے۔ آخری پیش کش کے طور پر گولڈانس کے ڈرامے 'Seventh of the two masters' کے بعض ٹکڑے پیش کیے گئے۔ اس کے بعد انھیں فنکاروں نے ایک الوداعی نغمہ گاتے ہوئے مدعو شعرا کا نام لے لے کر انھیں گلاب کے پھول پیش کیے۔

اس رنگارنگ پروگرام کے بعد بھارت بھون کی جانب سے مہمان شعرا کو ایک ایک شال اور میلے کی تصویروں کا مکمل البم پیش کیا گیا۔ یہ تحفے ان کی خدمت میں پیش کیے یہاں

آئے ہوئے مختلف زبانوں کے مشاہدین نے۔ اس تقریب کا سب سے آخری مرحلہ تھا بھارت بھون کے سکریٹری اور اس میلے کے مہتمم اشوک باجپئی کی اختتامیہ تقریر۔ جذبہٗ و تاثر میں ڈوبی ہوئی اس تقریر میں اشوک باجپئی نے کہا کہ اس میلے کے انعقاد میں ہمیں کئی مشکل اور آزمائشی مرحلوں سے گذرنا پڑا لیکن ہمارے بلند حوصلوں اور مصمم ارادوں نے اس عظیم شعری اجتماع کے خواب کو بالآخر شرمندۂ تعبیر کر ہی دیا۔ انھوں نے کہا کہ مہمان شاعروں اور ہندستان کے ادب دوستوں کی شرکت نے اس شاندار شعری میلے کو یادگار بنا دیا۔ یہاں آکر عالمی شاعری کی مختلف آوازوں کے ذریعے ہمیں دنیا کو اس کے تمام رنگوں میں دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا ہے اور ہم نے ذوق و وجدان کی سطح پر اس مختلف الجہات شاعری سے غیر معمولی استفادہ کیا ہے۔ میلے کی شاعرانہ اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اشوک باجپئی نے کہا کہ اس تقسیم ہوتی ہوئی دنیا میں شاعری ہی ہمیں متحد رکھنے کا واحد ذریعہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ اس اجتماع کا اختتام نہیں التوا ہے۔ اس کا جشن ہمارے دل و دماغ میں ہمیشہ برپا رہے گا۔ جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس جشنِ شاعری کے یہ سات دن اگر مجھے اپنی پوری زندگی کے عوض بھی ملے ہوتے تو بھی میں انھیں بخوشی قبول کر لیتا۔

اشوک باجپئی کی تقریر ختم ہو چکی تھی لیکن ہال میں ان کی آواز اب بھی گونج رہی تھی۔ سامعین سے خالی ہوتا ہوا 'انتر نگ' اب ویران ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی گل ہوتی ہوئی روشنیوں کو دیکھا اور باہر نکل آیا۔ یہاں بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ لوگ ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ ان میں سے بعض کو اسی وقت اپنی منزلوں کی طرف لوٹ جانا تھا۔ آج بھارت بھون کی جانب سے شعرا اور مشاہدین کو ہوٹل فلک نما میں رات کے کھانے پر مدعو کیا گیا تھا۔ جو لوگ اس وقت رختِ سفر نہیں باندھ رہے تھے وہ فلک نما کی طرف جا رہے تھے۔ بھارت بھون کے صدر دروازے پر گاڑیوں کی ایک قطار کھڑی تھی اور ہم ایک ایک دو دو کر کے ان گاڑیوں میں بیٹھتے جا رہے تھے۔ میں نے جس گاڑی کا دروازہ کھولا اس میں سویڈن کے شاعر ٹوماس ٹرانسٹرومر کی دوست پہلے سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ دہلی کے سویڈن سفارت خانے میں مقیم یہ خاتون محض ٹرانسٹرومر کی رفاقت کے لیے اس میلے میں آئی تھیں۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد

جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں لکھنؤ سے آیا ہوں تو وہ خوشی سے کھل اٹھیں۔ انھوں نے بتایا کہ میں خود بھی دو سال قبل لکھنؤ جا چکی ہوں اور اس شہر کی خوشگوار یادیں اب بھی میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ انھیں یہاں کی تاریخی عمارتوں کے در و بام یاد آنے لگے اور وہ ان عمارتوں کے وسیع اور کشادہ صحنوں اور احاطوں میں گزارے ہوئے لمحوں کا ذکر کرنے لگیں۔ اسی بیچ کار 'فلک نما' کے احاطے میں داخل ہوگئی۔ ٹرانسٹرومر کی دوست گاڑی سے اتر کر اپنے کمرے میں چلی گئیں اور میں اس کھلے ہوئے صحن میں جا کر بیٹھ گیا جہاں کھانے کی میزیں سجی ہوئی تھیں۔ لیکن یہاں مجھے کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے ایک بیرے سے اس کا سبب دریافت کیا تو اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر دیا جس کا مطلب تھا کہ سب لوگ وہاں جمع ہیں۔ میں اس کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ صراحیوں کے منہ کھلے ہوئے ہیں اور جام پر جام لنڈھائے جا رہے ہیں۔ شعرا اور مشاہدین ایک ہی صف میں کھڑے ہوئے اپنے خشک ہونٹوں کو تر کر رہے تھے اور جیسے جیسے ان کے ہونٹ تر ہوتے جا رہے تھے، اُن کی تشنگی بڑھتی جا رہی تھی۔ دوسری دنیاؤں میں سیر کرتے ہوئے ان بلانوشوں نے مجھے بھی 'سیر فلک' کی دعوت دی اور جب میں نے اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کیا تو انھوں نے میری ہوش مندی پر شک کیا۔ یہ سب دراصل اس جشنِ شاعری کی کامیابی کا جشن منا رہے تھے۔ اس وقت ان کے دل کدورتوں سے پاک تھے اور دماغ محبت کی خوشبوؤں سے معطر۔

کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ خُم پر خُم چڑھاتے ہوئے یہ لوگ کمرے سے نکل کر بہکتے ہوئے قدموں سے کھانے کی میزوں کے قریب پہنچنے لگے اور اپنی پلیٹوں میں اپنی اپنی پسند کی چیزیں رکھ کر اس کشادہ صحن میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ پھر خمار آلود لہجوں میں ایک دوسرے سے شعر و ادب پر غیر رسمی گفتگو کرنے لگے۔ مہمان شعرا کی بیویاں بھی اپنی چڑھی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس گفتگو میں برابر سے حصہ لے رہی تھیں۔ کریگ رین یہاں بھی خواتین کے اردگرد منڈلا رہے تھے۔ رابرٹو ہوارو ز کارلوس مرسیانو کے ساتھ بیٹھے ہوئے کسی ادبی نکتے کی وضاحت کر رہے تھے۔ ہومیر وایرجس اور ایپّا پانیکر ایک دوسرے کی شاعری کے رموز کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میروسلاو ہولب ایک کونے میں کھڑے ہوئے کسی اخبار والے

کے سوالوں کے جواب دے رہے تھے۔ فیرینتس یوہاش کا خوبروتر جمان مشاہدوں میں گھرا ہوا یوہاش کے جذبات کی ترجمانی کر رہا تھا۔ کچھ مشاہدین ہواروز' مرسیانو اور ٹومس ٹرانسٹرومر کے ساتھ تصویریں کھنچوا رہے تھے۔ صحن کے برآمدے میں کچھ مقامی ادیب تیز تیز آوازوں کے ساتھ ایک دوسرے سے اُلجھ رہے تھے اور فضل تابش بار بار انھیں خاموش کر رہے تھے۔ اختر الایمان اور ان کی بیگم اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔

ستاروں سے بھرے ہوئے آسمان پر مہتاب تیزی سے گردش کر رہا تھا۔ میں نے ڈھلتی ہوئی رات کی جاتی ہوئی ساعتوں کو محسوس کیا اور سب سے گلے مل کر فضل تابش کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل چلا آیا۔ اس ہوٹل میں یہ میری آخری رات تھی۔ بہت سے مشاہدین یا تو ہوٹل چھوڑ چکے تھے یا چھوڑ رہے تھے۔ اس وقت بھی کچھ لوگ سامانِ سفر باندھ رہے تھے۔ میں نے ان کو سلامِ رخصت کیا اور اپنے کمرے میں جا کر محوِ خواب ہو گیا۔

برخاست کی چراغوں کو پروانگی ہوئی

صبح میری آنکھ کُھلی تو میں نے بستر پر لیٹے ہی لیٹے ہوٹل پر چھائے ہوئے سناٹے کو محسوس کر لیا۔ آج نہ تو بار بار کھلتے بند ہوتے ہوئے دروازوں کی آوازیں آئیں نہ راہداریوں میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آہٹیں سنائی دیں اور نہ چائے کی کشتیاں ہاتھوں میں لیے ہوئے ہوٹل کے خدمت گاروں نے ہر دروازے پر دستک دی اور نہ ہی ہوٹل کے احاطے میں بھارت بھون کی بس نے ٹھیک وقت پر آ کر ہارن بجایا۔ یہ سنّاٹا میرے اندر اترتا جا رہا تھا۔ میں نے بستر سے اٹھتے ہی اپنا سامان باندھنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہوٹل کا ایک خدمت گار میرے کمرے کے اندر آیا اور میرے بندھے ہوئے سامان کو اس طرح دیکھنے لگا گویا جاننا چاہ رہا ہو کہ میں کمرہ کتنی دیر میں خالی کر دوں گا۔ میرا سامان بندھ چکا تو اسی خدمت گار نے اِسے ہوٹل کے لاؤنج میں پہنچا دیا۔ یہاں سبودھ سرکار، مالیکا سین گپتا اور راجہ رام بھی موجود تھے۔ ہم سب کو شام کی گاڑیوں سے روانہ ہونا تھا۔ میں نے تاثرات کے رجسٹر میں ہوٹل کے منیجر مسٹر خان کے حسنِ سلوک کے سلسلے میں چند مدحیہ جملے تحریر کیے اور اس گاڑی کا انتظار کرنے

لگا جو ہم سب کو یہاں سے بھارت بھون کے مہمان خانے تک لے جانے والی تھی۔ گاڑی آئی تو ہم سب اس میں بیٹھ کر بھارت بھون کے مہمان خانے پہنچ گئے اور یہاں اپنا سامان رکھ کر بھارت بھون کی سیر کرنے لگے۔

آج یہاں کے وہ صحن اور احاطے بالکل خالی پڑے تھے جو کل تک ادب اور شاعری کے دل دادگان سے بھرے ہوئے تھے۔ جلسہ گاہ کے ان برآمدوں میں بھی کوئی نہیں تھا جہاں جمع ہو کر لوگ روز کے اجلاسوں کی تفصیل سے آگاہ ہوتے تھے۔ اس میلے میں روس کی بیلا اخماد یلونا، کیوبا کی نینسی موریجان، جنوبی افریقہ کے ڈینس بروٹس، یوگوسلاویہ کے واسکو پوپا، امریکہ کے ایلن گنسبرگ اور جان ایش بری، میکسکو کے آکتویو پاز، پولینڈ کے تادیوش روزی وچ اور مغربی جرمنی کے گنترکنرت جیسے بڑے اور اہم شاعر بہ وجوہ شریک نہیں ہو سکے تھے۔ میں اس سنسان برآمدے میں اِس وقت اِن سب کے معذرت ناموں کو پڑھ رہا تھا۔ برآمدے سے نکل کر میں ان چبوتروں کی طرف بڑھ گیا جن کے پہلو میں بہتی ہوئی جھیل نے اپنی خنک ہواؤں سے کل تک سارے منظروں کو معطّر کیا تھا۔ میرے سامنے اِن معطر منظروں کا ہر مرقع روشن ہوتا جا رہا تھا۔ ان مرقعوں میں کبھی ہولب نظر آتے کبھی ہوا روز کبھی پارا کبھی اسپنڈر کبھی ایپاّ پانیکر کبھی رما کانت رتھ کبھی یو ہاش اور کبھی ٹرانسٹرومر۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان کی شاعری اور ان کی گفتگو نے میری ذات کے بہت سے گوشوں کو منوّر کر دیا تھا۔ روشنی سے معمور میں ان ویران چبوتروں پر بیٹھا ہوا یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں یہاں نہ آیا ہوتا تو کتنی روشنیوں سے محروم رہتا۔ مجھے گنسبرگ، ایش بری اور آکتویو پاز کے اس میلے میں نہ آنے کا دکھ بھی تھا اور ہولب' ہوا روز اور اسپنڈر کو دیکھ لینے کی خوشی بھی۔ مجھے بہت کچھ کھو دینے کا غم بھی تھا اور بہت کچھ پا جانے کی مسرّت بھی۔ اس میلے میں دنیا کے پانچ اہم شاعروں (پارا، ہوا روز، کاردینال، ایریجس، مرسیانو) کی نظموں کو ہسپانوی زبان میں سن کر مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ ہسپانوی زبان اب دنیا کی سب سے پر اثر اور طاقتور زبان بنتی جا رہی ہے۔

جھیل سے دیر تک خاموش گفتگو کرنے کے بعد میں پھر بھارت بھون کے کُھلے ہوئے صحن میں آ گیا جہاں اشوک باجپئی اپنے مہمانوں کو رخصت کر کے ابھی ابھی پہنچے تھے اور روز کی

طرح بالکل تازہ اور چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس شخص میں کام کرنے کی کتنی زبردست قوت ہے کہ کبھی تھکتا ہی نہیں ہے اور کام کرنے کی اس قوت میں وہ صلاحیت بھی موجود ہے جو امور کی انجام وہی میں کسی کو حرف گیری کا موقع نہیں دیتی۔ اشوک باجپئی اس وقت بعض مقامی ادیبوں اور دو۔ چار بیرونی مشاہدوں میں گھرے بیٹھے تھے۔ اور یہ سب اُنھیں نہ صرف میلے کی شاندار کامیابی پر مبارک دباد دے رہے تھے بلکہ اس بات کا اعتراف بھی کر رہے تھے کہ اس میلے کا انعقاد کر کے اشوک باجپئی نے ہندستان کی ادبی تاریخ میں ایک غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے نیز شاعری کے سامعین کو عالمی شاعری کے نئے افقوں سے روشناس کرایا ہے۔ میں انھیں لوگوں میں وقت گذارتا رہا پھر بھارت بھون کی کینٹین میں دن کا کھانا کھانے کے بعد مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی چلا گیا۔ یہاں فضل تابش اور وقار فاطمی موجود تھے۔ فضل تابش نے مجھے اکاڈمی کے چند تازہ مطبوعات تحفتہً مرحمت فرمائے۔ وہ اس وقت اپنے دفتری کاموں میں اُلجھے ہوئے تھے اور جیسے ہی انھوں نے ان کاموں سے فرصت پائی ہم سب اٹھ کر پرانے شہر کی طرف چل دیے۔ دیر تک پرانے شہر کے گلی کوچوں کی سیر کرنے کے بعد ہم اس مقام پر پہنچے جہاں فضل تابش کے صاحبزادے عنقریب کھانے کا ایک شاندار ہوٹل کھولنے والے ہیں۔ یہ جگہ دیکھنے کے بعد ہم اسی سے قریب ایک اور مکان میں داخل ہوگئے جہاں اپنی عرفیت عطوٗ بھائی کے نام سے مشہور بھوپال کے ایک بزرگ صحافی رہتے ہیں۔ یہاں بیٹھ کر ہم نے جی بھر کر ایک دوسرے کا کلام سنا، اچھے شعروں پر سر دُھنا اور آفتاب کے غروب ہوتے ہی ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ فضل تابش، وقار فاطمی اور عطوٗ بھائی نے مجھے گلے لگا کر رخصت کیا اور میں ایک آٹو رکشا میں بیٹھ کر بھارت بھون کے مہمان خانے پہنچ گیا۔ یہاں بھارت بھون کی ایک گاڑی مجھے اسٹیشن لے جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ میں نے اپنا سامان گاڑی میں رکھا اور اسٹیشن کے لیے روانہ ہوگیا۔ اسٹیشن پر لکھنؤ کے معروف ہندی شاعر نریش سکسینہ بھی موجود تھے جنھوں نے اس میلے میں 'انترنگ' کے باہر کی ساری سرگرمیوں کی فلم بندی کی تھی۔ وہ بھی اسی گاڑی سے لکھنؤ واپس آ رہے تھے۔ ہم دونوں کو ایک ہی ڈبےّ میں جگہ ملی تھی۔ اپنی اپنی جگہیں سنبھال کر ہم نے بندھے ہوئے بستر کھول دیے۔ گاڑی نے ٹھیک وقت پر رینگنا شروع

کیا اور اس تاریخی شہر کی معدوم ہوتی ہوئی روشنیوں میں ہماری آنکھیں بند ہونے لگیں۔

چلتی ہوئی گاڑی میں شاید میری آنکھ اس وقت کھلی جب مندروں کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں اور مسجدوں سے اذان کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ اٹھا کر باہر دیکھا تو صبح کے منظروں پر کہرے کی دبیز چادر پڑی ہوئی تھی۔ میری منزل قریب آتی جا رہی تھی اور منظروں پر سے کہرے کی چادر دھیرے دھیرے اٹھتی جا رہی تھی۔ اور جیسے ہی یہ منظر میرے سامنے روشن ہوئے میں نے دیکھا کہ درختوں کی گھنی شاخوں سے کچھ پرندے نکلے اور کھلے ہوئے آسمان کی طرف پرواز کر گئے۔ مجھے یقین تھا کہ مختلف سمتوں میں اُڑتے ہوئے یہ پرندے اپنے پروں اور منقاروں کو بھگونے کے لیے جھیل میں ضرور غوطہ لگائیں گے۔ لیکن دور تک نگاہ ڈالنے کے باوجود جھیل مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ آسمان میں اڑتے ہوئے پرندے باریک نقطوں میں سمٹتے ہوئے معدوم ہو گئے۔ گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور تھوڑی ہی دیر بعد میں اپنے شہر کے مانوس راستوں سے ہوتا ہوا اپنے گھر پہنچ گیا۔

مصنف کی دوسری تصنیفات

- اردو غزل میں علامت نگاری : (ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
- یگانہ : انتخاب (ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
- قائم چاند پوری : انتخاب (ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
- ادب کی باتیں : تنقیدی مضامین
- کوّے اور کالا پانی (نرمل ورما) : ترجمہ - بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی
- مسعود حسن رضوی ادیب (مونوگراف) : بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی
- بحث و تنقید : تنقیدی مضامین
- غزل کا نیا علامتی نظام (ناشر: اتر پردیش اردو اکادمی)
- روحِ انیس (مسعود حسن رضوی ادیب) : تصحیح و ترتیب و پیش گفتار بہ اہتمام ساہتیہ اکادمی

زیر اشاعت

- کتبے پڑھنے والے : افسانے
- شہر عدم رفتگاں : شاعری
- جدید مغربی مصنفین

سال ۲۰۱۱ء کے نوبیل انعام یافتہ شاعر ٹومس ٹرانسٹرومر اور مصنف
Khushboo-e-Khaak
By
Anis Ashfaq